سورھیہ بادشاہ اور کورٹ مارشل

ستار و سطرود

ویر پبلیکیشن

بسم الله الرحمن الرحيم

سورھیہ بادشاہ

اور

کورٹ مارشل

مصنف

آفتاب نبی

ترجمہ

ستار وسطڑو

ویر پبلیکیشن کراچی سندھ پاکستان

نام کتاب
سورھیہ بادشاہ اور کورٹ مارشل

مصنف
آفتاب نبی

ترجمہ
ستار و سطر و

پبلشر
ویر پبلیکیشن

سن اشاعت
جون 2001

ایڈریس
پی او بکس نمبر 3160 پی ای سی ایچ
کراچی سندھ پاکستان

قیمت

آفتاب نبی

حروں کے مقدس مقام

گڑنگ بنگلہ کے نام

پیش لفظ

لکھنا ایک فن ہے جو کہ ہر انسان میں موجود ہوتا ہے، لیکن ان کا لفظوں میں استعمال کرنے والے دوسرے انسانوں سے عظیم ہوتے ہین کیونکہ اس فن کو لفظوں میں استعمال کرنا ایک ہنر ہے اگر وہ ہنر کسی کو آجاتا ہے تو وہ دوسرے انسانوں سے مختلف ہوتے ہیں، میں جب سے شعوری زندگی مین داخل ہوا ہوں تو اندر کے لفظوں کو روپ دینے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اس سلسلے مین آج ورِ پبلکیشن کی طرف سے محترم آفتاب نبی کی کتاب پر دو الفاظ لکھنے کے لئے بیٹھا ہوں اور سوچنے لگا ہوں کہ کیا لکھوں کیونکہ دو الفاظ لکھنے کا مقصد پورے عنوان کو دو لفظوں میں سمانا ہے۔ جناب آفتاب نبی کی کتاب سورھیہ بادشاہ اور کورٹ مارشل ورِ پبلکیشن کی جانب سے آپ کے ہاتھوں میں دیتے ہوئے فخر محسوس کر رہا ہوں۔ میرے فخر کرنے کے دو اسباب ہیں۔ پہلا سبب یہ ہے کہ میں شہید سورھیہ بادشاہ کے بہادرانہ کردار کو اکیسویں صدی کے نوجوانوں کو انٹرنیٹ اور کتاب کے ذریعہ پوری دنیا میں واقف کرا رہا ہوں اور اس کے بعد دوسرا سبب یہ ہے کہ میرے نانا سرجن فقیر محمد وسطڑو جو پاکستان سے پہلے یعنی حر موومنٹ کے دوران ضلع سانگھڑ میں سول سرجن اور حیدر آباد سینٹرل جیل میں میڈیکل افسر تھے۔ جن کی سورھیہ بادشاہ سے نیازمندی تھی۔ 1972-73ء میں میں ان کی ذاتی کلینک (نوشہرو فیروز) ان کی خدمت میں بیٹھا تھا تو وہ سورھیہ بادشاہ کی بہادری شجاعت اور سخاوت کی باتیں کر کے اپنی آنکھوں سے آنسو بہا دیتے تھے۔

میں نانا کے آنسو دیکھ کر اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکا۔ وہ اپنے پرانے ساتھیوں‘ خاص طور پر ایک ریٹائرڈ جج سے گفتگو کرتے تھے جو گھنٹوں چلتی تھی۔ گفتگو انگریزی میں ہوتی تھی جو میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ ایک دن حر تحریک اور سورھیہ بادشاہ پر گفتگو کا آغاز کیا تو نانا کے آنسو چھلک پڑے۔ جب میں نے نانا سے اس کا سبب جاننا چاہا تو انہوں نے کہا کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔ ان کے دوست نے کہا کہ اپنی مادری زبان میں بات کرتے ہیں تاکہ ان بچوں کو اپنے ہیروز کے متعلق معلوم ہو۔ نانا بتا رہے تھے کہ انگریزوں نے حروں کو کچلنے میں اپنی کوئی کسر نہیں چھوڑی لیکن ان سے زیادہ ظلم ستم غداری بلوچ قبائل کے لوگوں خاص طور پر بگٹی بلوچ کے لوگوں نے کی جن کو انگریزوں نے بلوچستان سے بلا کر سانگھڑ میں آباد کیا۔ انہوں نے حروں پر وہ مظالم کئے کہ اس معاملے میں انہوں نے انگریزوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا۔ وہ 10 روپے میں ایک حر کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کرتے تھے اور پکڑ جانے والے اکثر حروں کو انگریز سرعام پھانسی دیتے تھے۔

نانا کے آنسو‘ سورھیہ بادشاہ اور حر تحریک سے محبت میرے اندر میں ایک ولولہ اور محبت پیدا کی کہ میں بھی اس معاملے میں معلومات حاصل کروں جو محبت جناب آفتاب نبی نے فراہم کی۔ آفتاب نبی کی شخصیت اور ان کی قلمی جستجو اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوتی ہے۔ اس بارے میں کچھ کہنا نہ کہنے کے برابر ہے۔ میری نظر میں پیر صاحب وہ "شہید سندھ" ہیں جس نے سندھ کی تاریخ میں بہادرانہ جنگ کے فلسفے کا وجود برپا کیا سورھیہ بادشاہ کی زندگی نو آبادیاتی انگریز قوتوں کے خلاف جدوجہد کا اعلان تھی اور شہادت اعلان جنگ تھی۔ سندھ کی آزادی کے لئے سورھیہ بادشاہ کی تحریک سندھ کی سرحدوں اور سندھیوں کی عزتوں کی محافظ تھی۔ لیکن افسوس جو سورھیہ بادشاہ 20 مارچ 1943ء میں شہید ہو گیا۔ اس وقت انگریز اور ان کی نوکر شاہی نے بڑے جشن منائے۔ 1947ء میں انگریز سامراج اپنے چاپلوس جاگیرداروں اور نوکر شاہی کو اقتدار دے کر چلے گئے لیکن افسوس کہ جو حر انگریز سامراج کے ساتھ لڑے انہی کے خلاف 1952ء یعنی پاکستان بننے کے بعد بھی ظلم و ستم جاری رہا‘ جو انگریز کے دور میں تھا۔ آج سورھیہ بادشاہ اور حروں کی تحریک پورے برصغیر اور سندھ کی نئی نسل نے اس طرح بھلا دی ہے جیسے سورھیہ بادشاہ اور حر کھلی ہوئی

آنکھوں کے خواب تھے۔ میری نظر میں برصغیر کی مظلوم قومیں جس معاشی' سیاسی اور سماجی غلامی اور عذابوں میں مبتلا ہیں اس کا سبب نئی نسل کے لوگوں نے سورھیہ بادشاہ کی شہادت اور حر تحریک کو بھلا دیا ہے۔ اب بھی وقت نہیں گیا ہے آج بھی ہم سورھیہ بادشاہ کے بتائے ہوئے راستے پر عمل کریں تو وہ سب کچھ حاصل کر سکتے ہیں جو سورھیہ بادشاہ برصغیر کے متعلق چاہتا تھا۔

اس کتاب کو خوبصورت بنانے میں جو کوشش کی گئی ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس کے ساتھ جن دوستوں بزرگوں نے میرا ساتھ دیا ان میں محترم محمد بچل سانگری' خان محمد مہر' ڈاکٹر سہیل وسطڑو' جناب ظفر احمد فاروقی کا شکر گزار ہوں جنھوں نے میری ہر طرح کی سچائی کے ساتھ رہنمائی کی۔ اس کے ساتھ ساتھ سندھ کی تاریخ دان ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو' ملک کے مایہ ناز ادیب عبدالقادر جونیجو' اور ڈاکٹر قمر واحد کا میں احسان مند ہوں۔

میں جناب آفتاب نبی کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جنھوں نے اپنی مصروفیات سے میرے لئے بار بار وقت نکالا اور اس کتاب کو تکمیل کرنے میں میری رہنمائی کی۔ آفتاب نبی نے یہ کتاب لکھ کر سندھ کی نامکمل تاریخ کو آگے کیا ہے جو ایک بڑا کارنامہ ہے اور اسی موضوع پر ان کا قلم رواں دواں ہے' انشاء اللہ جلد آفتاب نبی صاحب کی ایک اور کتاب "بچو بادشاہ اور پیر وورزیر" آپ کے ہاتھوں میں ہوگی۔ ویر پبلیکشن کی جانب سے حروں پر یہ پہلی کوشش ہے ابھی چار کتابیں مزید زیر اشاعت ہیں وہ بھی جلد آپ کے ہاتھوں میں ہوں گی۔ جس میں ایک اہم کتاب "حر تحریک اور دیسی دلالوں کا کردار" شامل ہیں جس سے مقامی قومی غداروں کا کردار سامنے آئے گا۔

آخر میں میں اپنی قارئین سے گزارش کروں گا کہ اردو میری مادری زبان نہیں لہذا قاری اگر کہیں اردو کی کوئی غلطی محسوس کریں تو اس کی معافی چاہتا ہوں۔

خاکسار

ستار وسطڑو بچر

نوشہرو فیروز

E:mail
sattar_vistro@hotmail.com

مقدمہ

روایتی طور پہ سندھ کی سرزمین کو پیروں، فقیروں اور درویشوں کی سرزمین کہا اور سمجھا جاتا ہے سندھی لوگ بڑے عقیدے پرست اور مذہبی ہوتے ہیں۔ وہ زندگی گزارنے کے لئے اور سیدھے راستے پر چلنے کے لئے ایک رہبر اور رہنما منتخب کرتے ہیں جس کو مرشد سمجھا جاتا ہے۔ بغیر مرشد ہونے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح سندھ میں سینکڑوں پیر سید اور درویشوں کی درگاہیں موجود ہیں، جہاں بڑے رنگ رچے ہوئے ہیں۔ سندھی لوگ اپنی دل کی پریشانیاں وہاں آکر ختم کرتے ہیں۔ اکثر درگاہیں ایسی بھی ہیں جہاں زندہ پیر بھی رہتے ہیں ایسی بڑی اور اہم درگاہوں اور پیروں میں ایک راشدی خاندان کا پیر بھی ہے جو سندھ میں ایک بااثر اور اہم سمجھا جاتا ہے جس کو پیر پگاڑا کہا جاتا ہے۔ پاگاڑو خاندان کو سندھ میں آنے والے واقعہ کو محمد بن قاسم کی آمد سے تعبیر کرتے ہیں۔ سندھ کے اندر ان کی پہلی رہائش گاہ سیوہن کے نزدیک ایک چھوٹے سے گاؤں "لکی" ہے جو پہاڑوں کے نزدیک ہے اور یہ سندھ کی مٹی کی خوشبو ہے جو اب یہ پیر اور سید لکیاری سادات کہلاتے ہیں۔ اس خاندان نے 19ویں صدی کے شروع میں پذیرائی حاصل کی جب ان کے ایک بزرگ سید محمد راشد شاہ گدی پر بیٹھے جو ایک بڑے بزرگ اور پہنچے ہوئے پیر تھے جس نے سندھ کے اندر اور باہر مذہب اسلام کی بڑے پیمانے پر تبلیغ شروع کردی اور ہزاروں

لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ اس زمانے یعنی 19ویں صدی کی دوسرے دہائی میں "پیرپگاڑا" کی ہدایت پر سندھ سے بہت سے افراد جو پیر کے مرید تھے۔ سید احمد شہید کی مدد کے لئے افغانستان اور سرحد کے پہاڑوں پر جاکر سکھوں سے لڑے۔ ان کی واپسی کے بعد پیر صاحب کے مریدوں نے مل کر حروں کے فرقے کے نام سے ایک جماعت بنائی جو آگے چل کر حر فورس کے نام سے مشہور ہوئی اور وہ لوگ پیر صاحب کے لئے جان، مال، دولت کی قربانی دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ 19 اور 20 ویں صدی کے دوران سندھ کے اندر حروں کی دو بڑی بغاوتیں اٹھیں جنھوں نے اس دور کے حکمرانوں اور حکومت کو ہلا دیا اور ان کو کافی مشکلوں میں ڈال دیا تھا۔ پہلی بغاوت 19ویں صدی کے آخری دہائی میں اٹھی جو کچھ سالوں تک مسلسل چلی ان میں مشہور حر رہنماؤں کے نام مشہور ہوئے۔ جن میں بچو بادشاہ، پیرو وزیر اور گلو گورنمنٹ وغیرہ۔ اس شورش کو انگریز سرکار کے مشہور افسر لیوکس نے اپنی حکمت عملی کے ذریعے سختی سے کچلا۔ اس دوران سانگھڑ اور مکی جھیل کے اطراف والے علاقوں میں انگریز سرکار نے حروں کا زور ختم کرنے کے لئے بلوچ قبیلوں کو بلوچستان سے بلا کر آباد کیا اور ان کو زمین وغیرہ دی گئی اور ان کو حروں کے خلاف استعمال کیا اور جو حر جنگجو اور اہمیت والے تھے ان کو سندھ بدر کر کے ہندوستان کے مختلف علاقوں میں بھیجا گیا۔ اسی طرح سندھ میں خاردار سسٹم شروع کیا گیا جہاں باغی حروں کے بہت سے گروپوں کو ان میں نظر بند کیا گیا۔

حروں کی دوسری بڑی بغاوت دوسری جنگ عظیم کے دوران یعنی 1940ء والی دھائی میں ہوئی تھی۔ اس بغاوت کے دوران پہلے شہید ہونے والے حر رہنماؤں کے ساتھ دوسرے بھی رہنماؤں کے نام سننے میں آئے۔ ان کے ساتھ رحیم ہنگورو وغیرہ بھی تھے۔ اس بغاوت کے دوران انگریز سرکار بہت دباؤ مین آئی کیونکہ اس وقت دوسری عالمگیر جنگ جاری تھی اور انگریزوں کو پوری دنیا میں دشمن فوجوں کا سامنا تھا۔ یورپ میں جرمن فوجوں اور مشرق مین جاپانی فوجیں تمام تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں یہاں تک کے جاپان کی فوجیں برما کو فتح کرکے آسام کے پہاڑوں تک آپہنچی تھی اور اسی طرح ہندوستان فوج میں بھی سبھاش چندر بوش کی رہنمائی میں ہندوستان کی ایک آزاد فوج جنم لے چکی تھی اور اس

صورت حال میں انگریز حکومت سندھ کے حالات کو تمام نزدیک اور باریک بینی سے دیکھ رہی تھی اور ان کی سرکار نے حالات کا جائزہ لے کر فوج کے ایک "کور" کو سندھ کے اندر بلا کر جنرل رچرڈ سن کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر مقرر کیا گیا اور سندھ کے باغیوں اور بغاوت کو کچلنے کے لئے کچھ ایئر فورس (ہوائی فوج) کے دستے بھی بلائے گئے اور استعمال کئے گئے۔ سندھ کے اندر بغاوت کو کچلنے کے لئے صحرائے تھر کے اندر بھی بہت ہوائی جہاز لائے گئے۔
اس حر بغاوت کے دوران گدی پر چھٹے پگاڑا پیر صبغت اللہ شاہ راشدی تھے ان کے انگریز سرکار سے تعلقات شروع سے بڑے نازک اور پیچیدہ تھے۔ 29-1928ء میں انگریز فوجوں نے پیر جو گوٹھ پر چھاپہ مارا جس کے ساتھ نو آبادی پولیس بھی تھی اس چھاپے کے دوران ہتھیار بر آمد کئے گئے اور ایک نوجوان لڑکے کو بھی گرفتار کیا گیا جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس کو پیر صاحب نے ایک صندوق میں قید کر کے رکھا تھا۔ اس سلسلے میں پیر صاحب پر سکھر میں مقدمہ چلایا گیا جس کے لئے پیر صاحب نے محمد علی جناح کو اپنا وکیل مقرر کیا۔ بہر حال اس صندوق کیس میں اسپیشل مجسٹریٹ ادھارام نے پیر صاحب کو آٹھ سال قید کی سزا سنائی۔ کچھ تاریخی ذرائع سے معلوم ہوتا ہے کہ انگریز سرکار پہلے ہی اس کیس میں سزا دینے کا فیصلہ کر چکی تھی۔ تمام عرصہ پیر صاحب کو ہندوستان اور بنگال کے مختلف جیلوں میں قید رکھا گیا۔ اس دوران بنگال کے جیلوں میں پیر صاحب کے بنگالی قوم پرستوں اور دہشت گردوں سے تعلقات بڑھے۔ کہا جاتا ہے کہ پیر صاحب سیاسی طور پر ان سے کافی متاثر تھے۔ آخر کار 37-1936ء میں پیر صاحب جب سندھ واپس آئے تو کافی تبدیل ہو چکے تھے عملی طور پر وہ کسی خاص پروگرام پر عمل پیرا تھے کیونکہ انہوں نے آتے ہی تحریک کے اندر حر مجاہد بھرتی کرنا شروع کر دیئے اور ان کو ٹریننگ دلائی۔ اس طرح افواہ اٹھنے لگی کہ پیر صاحب انگریزوں کے خلاف جنگ شروع کرنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اس دوران وہ ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں خاص طور پر کانگریسی لیڈروں سے زیادہ نزدیک رہنے لگے اور مسلسل ان سے رابطے میں رہے۔ اس خطرے کو جانچنے کے لئے انگریز سرکار نے پہلے پیر صاحب کو کراچی میں نظر بند کیا ان کو کہا گیا کہ وہ کراچی سے باہر نہ نکلیں اگر نکلے تو اجازت کے بغیر نہ نکلیں۔ لیکن پیر صاحب اچانک کراچی سے نکل کر گڑنگ بنگلے جا کر بیٹھ

گئے اور انگریز سرکار نے ان کو ایک مرتبہ پھر گرفتار کرکے ہندوستان کی مختلف جیلوں میں رکھا۔ پیر صاحب کی گرفتاری کے بعد حروں نے بغاوتی عمل اور تیز کرنا شروع کردیا۔ خاص طور پر سرکاری املاک مثلاً فون، بجلی، ریلوے اور دوسرے اہم دفتروں کو نشانہ بنایا گیا ان پر حملے شروع کردیئے اور بھی نقصان پہنچایا گیا۔

انگریزوں کو خطرہ تھا کہ کہیں وفادار شخصیتوں اور سرکاری افسروں کو نشانہ نہ بنایا جائے اس لئے انگریز سرکار نے فیصلہ کیا کہ پیر صاحب پر تیزی کے ساتھ مقدمہ چلا کر ان کو ختم کیا جائے تو 1943ء کے شروع میں پیر صاحب کو ہندوستان کے جیل سے نکال کر سندھ لایا گیا اور انہیں حیدر آباد سینٹرل جیل لا کر قید کیا گیا۔ جیل کے اندر ہی پیر صاحب پر مقدمہ چلا کر پہلے سے تیار کئے گئے فیصلے کے مطابق مارشل لاء کورٹ نے پیر صاحب کو سزائے موت کی سزا سنائی اور (20 مارچ 1943ء کو سینٹرل جیل حیدر آباد میں پھانسی دی گئی اور ان کے مریدوں کو دیدار عام کرایا گیا اس کے بعد کوئی خبر نہیں کہ پیر صاحب کے جسد خاکی کو کہاں دفن کیا گیا۔ وہ آج تک پتہ نہیں چل سکا۔ پیر صاحب کی شہادت کے بعد بھی حر بغاوت بڑے زور و شور سے جاری رہی اور باوجود کافی کوششوں سے یہ بغاوت ہندوستان کے بٹوارے یعنی 1947ء تک جاری رہی اور انگریز سرکار اپنے طاقت کے زور پر بھی اسے ختم نہیں کرسکی۔ یہ کتاب سندھ کے آئی۔ جی پولیس اور سندھ کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے جناب آفتاب نبی کے ان مضامین پر مشتمل ہے جو اس تحریر پر لکھے ہوئے ہیں۔ خاص طور پر پیر صبغت اللہ شاہ راشدی کے خلاف چلائے گئے کیس کی کارروائی کے طور پر لکھا ہوا ہے۔ ان منصوبوں میں چلائے گئے کیس کا تفصیلی ذکر ہے۔ آفتاب نبی صاحب نے کافی محنت، جستجو اور تحقیق کے بعد یہ مضمون ڈان میں لکھے اور ان مضامین میں انگریزوں کی سندھ کے متعلق خاص طور پر حروں پر بنائی گئی پالیسی اور حر تحریک کے متعلق گواہوں پر بھی کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بہت سارے انگریز سرکار کے افسروں کی خط و کتابت کو اس میں شامل کیا گیا ہے۔ خاص طور پر ایچ ٹی لیمبرک جو اس وقت سندھ میں کمشنر تھے جس نے سندھ کی تاریخ پر بھی بڑا تحقیقی کام کیا اور خاص طور پر حر تحریک پر ان کاغذات اور دستاویزات جو لندن میں محفوظ ہیں ان کی اہم خط و کتابت کا کافی تفصیلی ذکر اس کتاب میں

ہے۔ آفتاب نبی ویسے تو ایک پروفیشنل پولیس افسر ہیں لیکن انہوں نے جس انداز میں حر تحریک کے متعلق یہ تحقیقی کام کیا ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہین جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔ اور سندھ کی تاریخ اور تحقیق میں ایک اضافہ اور قابل قدر کام شمار ہوگا۔ خاص بات یہ کہ اس کتاب کو ایک پروفیشنل پولیس افسر نے دور اندیشی کے ساتھ ترتیب دیا ہے اور اچھی طرح چھان بین کے بعد ترتیب دیا ہے۔ یہ کتاب تاریخ کا ایک اہم حصہ ثابت ہوگی۔ پڑھنے والوں کے لئے یہ کتاب تاریخی اہمیت کی حامل ہے کیونکہ اس میں نہ صرف ایک اہم تاریخی باب کا ذکر ہے اگر تاریخ کو تنقیدی نظر کے ساتھ پیش کیا جائے وہ بھی اس کتاب میں موجود ہے۔

آخر میں' میں نوجوان صحافی ستار وسطڑو صاحب کو مبارکباد پیش کرتی ہوں جنہوں نے اتنی محنت اور محبت کے ساتھ آفتاب نبی صاحب کے آرٹیکلز کو اردو/ سندھی میں کتابی صورت میں لاکر پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا۔ میری دعا ہے کہ دیر پبلیکشن اور ان کے روح رواں ستار وسطڑو آگے بھی اسی طرح کی اہم کتابوں کو پڑھنے والوں کے سامنے لائیں۔

ڈاکٹر حمیدہ کھوڑو
کراچی۔ سندھ پاکستان

حر تحریک اور آفتاب نبی

اگر مورخانہ ضد اور تفخر چھوڑ کر سیدھی سادی سی حقیقتوں کو مدنظر رکھا جائے تو عوامی ابھار کے حساب سے سندھ کی تاریخ شاہ عنایت شہید کی تحریک کو چھوڑ کر گہری خاموشیوں میں ڈوبی ہوئی نظر آتی ہے۔ اس لمبی خاموشی کو حر تحریک کے پہلے بہاؤ اور پھر دوسرے بہاؤ نے توڑا۔

گو کہ سندھ کی تاریخ میں عوامی سطح پر تو خاموشی رہی، مگر عوام کو چھوڑ کر فرماں رواؤں کی سطح پر اچھا خاصا شور نظر آتا ہے، مگر ان واقعات کو بھی ہمارے مورخوں نے تحریر کرتے وقت حقائق کے بجائے جذباتیت، رومانیت اور افسانویت کو کچھ زیادہ ہی اہمیت دی ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمیں جو تھوڑے بہت سائنسی فکر رکھنے والے محققین ملے وہ بھی سات سمندر سے پار آئے ہوئے انگریز تھے۔ آجکل سندھ کی تاریخ پر تحقیق کرنے والوں کو چند ایک دیسی ناموں کو چھوڑ کر ان انگریز مورخین کا ہی سہارا لینا پڑتا ہے۔ اب یہ معاملہ اور ہے کہ کہیں دور سے آیا ہوا اور انتہائی مختلف کلچر کا حامل مورخ ہمارے ہاں جنم لینے والے تاریخی حقائق کے پانی میں کتنا اتر سکتا ہے۔ میرے خیال میں تو اس کے پاؤں ہی بمشکل بھیگے ہونگے۔ پھر حروں کی تحریک تو چلی ہی انگریزوں کے خلاف تھی۔ ایسے میں انگریز کا "محقق" بننے کے بجائے "دشمن" بن کر تحقیق کرنا ایک انسانی فطری عمل بن جاتا ہے۔ ایسی صورتحال میں حر تحریک کو ایک ایسے محقق کی ضرورت تھی جو "تحقیق" کے ساتھ ساتھ "تفتیش" کے گر بھی جانتے ہوں، تاکہ وہ جذباتیت، رومانویت، افسانہ طرازی اور مخاصمانہ رویوں کو چھانٹ کر حقائق سامنے لے آئیں۔ یہ حسن اتفاق سمجھئے کہ محترم آفتاب نبی کی صورت میں ہمیں ایک ایسے ہم وطن محقق مل گئے جو تحقیق کے ساتھ ساتھ پولیس کے ایک اچھے اعلیٰ افسر ہونے کے ناتے "تفتیش" کے گر بھی جانتے ہیں اور بال کی کھال اتار کر اصل معاملات تک پہنچنے کی ذہنی قوت رکھتے ہیں۔ یہ "تفتیش" ہی ہوتی ہے جو محقق

کو اس بات پر مجبور کرتی ہے کہ وہ "دوست و دشمن" "بھائی اور غیر" اور "اپنے پرائے" کا خیال رکھے بغیر انسانی رشتوں سے بھرے ہوئے دریا میں ڈبکی لگا کر محض حقائق کو سامنے لا کر اپنے حاصل کردہ نتائج کو غیر جانبدارانہ انداز میں زیرِ تحریر لے آئیں۔

مصنف و منصف آفتاب نبی نے اپنی شدید پیشہ ورانہ سرکاری مصروفیات کے باوجود اس کتاب کا مواد جمع کرنے، ترتیب دینے اور تحریر کرنے میں جو محنت کی ہے اور جو انداز بیاں اختیار کیا ہے، اس کا پورا اندازہ تو تب ہی لگایا جاسکتا ہے، جب کوئی اس کتاب میں اتر جائے۔ یہ ایک محنت طلب اور داد طلب کام ہے۔

اصل میں یہ کتاب کچھ عرصہ پہلے ایک انگریزی روزنامہ میں دس قسطوں کی صورت میں چھپ کر داد وصول کر چکی ہے۔ یہاں شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھے کہ یہ سب کچھ پہلے انگریزی میں کیوں لکھا گیا۔ اس سوال کا جواب صاف صاف پڑا ہے جو کچھ اس طرح بنتا ہے۔

فلسطینیوں کے حقوق کے لئے دانشورانہ سطح پر اپنے قلم کو جھونک دینے والے اور اب تک ۱۷ شاندار کتابوں اور کئی ایک مضامین کے مشہور و معروف مصنف ایڈورڈ ڈبلیو سعید کچھ سال پہلے خون کے کینسر کا دھچکا کھانے کے بعد جب نیدرلینڈ میں **کمیو تھراپی** کے ذریعے رو بصحت ہوئے تو ان کو وطن کی یاد ستانے لگی اور وہ U.S.A کی آرام دہ زندگی چھوڑ کر فلسطین، مصر اور اسرائیل کی صحراؤں میں پاگلوں کی طرح ماضی کی تلاش میں آوارہ گرد ہوئے۔ پھر ان تجربات پر ایک رونے رلانے والی کتاب "Out of Place" لکھی۔ اسی کتاب میں اپنی مادری زبان عربی میں نہ لکھنے پر وہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "کیا، کیا جائے۔ سر پیٹا جائے کہ لکھنے کے معاملات میں انسان کبھی کبھی ایسے حالات میں پھنس جاتا ہے کہ انسان زبان کو سلیکٹ نہیں کرتا، بلکہ زبان انسان کو سلیکٹ کر ڈالتی ہے۔"

گو کہ ہمارے آفتاب نبی ان حالات کا شکار نہیں بنے اور اس وقت اپنے ہی وطن عزیز میں دن و رات تمام کر رہے ہیں مگر آج کل جس طرح کے تعلیمی اور سماجی حالات پائے جاتے ہیں، اس حساب سے اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنے وطن میں رہتے ہوئے بھی انساں کو زبان سلیکٹ کرے۔ انگریزی میں لکھنے کی دوسری وجہ یہ بھی بنتی ہے کہ بقول

جرمن اور فرانسیسی دانشوروں کے کہ اب اس بات میں کوئی شک نہیں رہا کہ انگریزی زبان کی ڈکٹیٹرشپ بڑھتی چلی جارہی ہے۔ جب جرمن اور فرانسیسی دانشور اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں تو اپنے ہی وطن عزیز میں اٹھنے والی حر تحریک کو دنیا میں متعارف کرانے کے لئے انگریزی کا سہارا ضرور بن جاتا ہے اور ایک طرح سے پڑھنے والوں کا دائرہ بھی وسیع ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ کہ اگر کتاب اچھی ہو' کام کی ہو تو اس کو اچھے مترجم مل ہی جاتے ہیں' جن میں سے ستار وسطڑو صاحب بھی ایک ہیں۔ یہ کچھ اسباب ہیں جو آفتاب نبی کو انگریزی کی طرف لے اڑے اور انہوں نے اپنے ہاتھ دکھادیے۔

انگریز محققین کو چھوڑ کر ہمارے یہاں اپنوں کی طرف سے اب تک حر تحریک کے متعلق جو کچھ سننے اور پڑھنے کو ملا ہے' اس مواد کو اگر گہرائی سے دیکھا جائے تو یہ مواد حقائق سے ہٹ کر جذباتیت' رومانیت اور افسانہ طرازی میں اتنا ڈوبا ہوا نظر آتا ہے کہ یہ ناممکنات کا گچھا بن کر ناقابل اعتبار بن جاتا ہے۔ حر تحریک کے دوسرے بہاؤ سے منسلک ابھی تک جو تھوڑے بہت لوگ پائے جاتے ہیں ان کے متعلق سندھی زبان کے معروف جرنلسٹ اسحاق منگریو کا کہنا ہے کہ یہ بزرگ لوگ نفسیاتی طور پر ابھی تک اپنے آپ کو حر تحریک کے زمانے میں موجود پاتے ہیں اور کسی بھی محقق یا جرنلسٹ کو انگریز کا مشکوک ایجنٹ سمجھ کر گفتگو میں شدید احتیاط برتتے ہیں اور کھل کر بات کرنے کے بجائے اس دور کے حروں کے کوڈ ورڈ میں بات کرتے ہیں جس کی وجہ سے محقق یا جرنلسٹ الجھ کر رہ جاتا ہے اور صحیح حقائق تک پہنچ نہیں پاتا۔

آج کل صورتحال یہ بنی ہوئی ہے کہ معیاری افسانوی ادب تک بھی عقلیت سے پرکھا جانے لگا ہے جبکہ حر تحریک تو ماضی قریب کی ایک بہت بڑی حقیقت ہے اس حقیقت پر سے صحیح معنوں میں آفتاب نبی نے پردہ اٹھایا ہے۔

ہمارے یہاں آج تک تحقیق کے سلسلے میں ایک عجیب وغریب اور الجھانے والی صورتحال پائی جاتی ہے' جو ایک طرح سے افسوسناک بھی ہے۔ یہ کچھ اس طرح ہے کہ جب ہم کسی بھی موضوع پر تحقیق کرنے نکلتے ہیں تو اس تحقیق کے نتائج کا فیصلہ پہلے کر دیتے ہیں اور پھر تحقیق کرتے ہیں بھائی اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو پھر ریسرچ میں سر کھپانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ تو بالکل اس طرح ہے کہ کوئی وکیل فیس لے کر یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ

فلاں یا فلاں کو قتل کے مقدمے میں سے آزاد کرواتا ہے اور پھر دلیل دیے ہی چلا جاتا ہے۔ جبکہ وکیل اور اسکالر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسکالر تو کسی اچھی پولیس افسر کی طرح ہوتا ہے وہ کوئی موضوع لے کر جب کام میں جت جاتا ہے تو اس کے سامنے نہ نتائج ہوتے ہیں اور نہ ہی کوئی فیصلہ۔ وہ لائبریریوں اور فیلڈ میں جاکر پہلے سرماری کرتا ہے اور پھر نتائج خود بخود اس کے سامنے آنے لگتے ہیں کہ جی اصل معاملہ کچھ اس طرح ہے۔ تحقیق کے ان حالات میں آفتاب نبی نے حر تحریک کے سلسلے میں پہلے نتائج مقرر کرنے کے بجائے' ایک اچھے پولیس افسر کی طرح تحقیق و تفتیش کی ہے اور پھر نتائج لے کر سامنے آئے ہیں۔ جب یہ کتاب آپ پڑھیں گے تو آپ کے سامنے پوری حقیقت سامنے آجائے گی۔

آج کل دنیا کے اچھے اچھے تعلیمی اداروں میں ریسرچ کے کام کے حوالے سے یہ بات سامنے آگئی ہے کہ جو بھی ریسرچ کی جائے اس ریسرچ کو جب لکھا جائے تو لکھنے کا انداز ایسا ہو کہ ایک طرف وہ کتاب آسان ہو' اور دوسری طرف انداز بیاں تخلیقی ہو تاکہ اس کتاب سے زیادہ سے زیادہ لوگ مستفیض ہوں اور Creativity کسی بھی تحقیقی کتاب کا لازمی حصہ بن گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اطلاقی سائنس سے متعلق لکھی ہوئی تحقیقی کتابوں پر یہ بھی لکھنے کے اس انداز کا اطلاق ہوچکا ہے یہ کتاب چاہے B.B.C کی طرف سے چھاپی ہوئی میڈیکل سائنس کی کتاب "Stress" ہو یا کائنات کے متعلق لکھی ہوئی کارل ساگاں کی سب کتابیں بمعہ "Cosmos" کے۔ یہی انداز بیاں آفتاب نبی صاحب میں پایا جاتا ہے جو ان کی تحقیق کی دنیا میں اعلیٰ مقام دلواتا ہے پڑھ لیجیے' آپ کو اندازہ ہوجائے گا۔

اس کتاب کے حوالے سے میرے مشاہدے میں ایک بڑی دلچسپ حقیقت بھی سامنے آئی ہے کہ جب یہ کتاب مقالے کی صورت میں روزنامہ "ڈان" میں چھپی تو اس کے بعد کافی پولیس افسران میں ریسرچ کا سینس پیدا ہوا اور اس وقت یہ افسران اپنے فرائض ادا کرنے کے ساتھ ساتھ کرمنالوجی کے سلسلے میں ریسرچ کرتے ہوئے پائے گئے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ریسرچ جرائم کو روکنے میں کام آئے گی۔ اس طرح آفتاب نبی نے دو دھاری تلوار چلا دی ہے۔ ایک طرف حروں کی تحریک سے متعلق اصل حقائق پڑھنے والوں کے سامنے آگئے ہیں تو دوسری طرف ان کی یہ ریسرچ سمجھدار پولیس افسروں کے لئے Inspiration کا ذریعہ بن گئی ہے۔

کسی کتاب کا ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ ایک بہت ہی مشکل کام ہے۔ میری نظر میں تو ترجمہ اصلی تحریر سے زیادہ مشکل ہے۔ شاید اسی وجہ سے اب ترجمے کو Recreation کہا جانے لگا ہے۔ ترجمے کے سلسلے میں لسٹن امریکا کے اس دور کے بہت بڑے لکھنے والے نوبیل لاریٹ اسپینش ناولسٹ گارشیا مارکیز سے متعلق ایک بڑی دلچسپ مثال سامنے آئی ہے، جو ان کے معروف ترین ناول "years of Solitute Hundred" دلوانے والے اس ناول کے ٹائٹل کے سلسلے میں ان کا کہنا ہے کہ جس اسپینش لفظ کا انگریزی معنی Solitute لکھا گیا ہے وہ اس طرح ہیں۔ اصل میں اصلی اسپینش لفظ کا معنی بنتا ہے "تنہائی و بے خوابی" جب انگریزی زبان کے بڑے بڑے اور مستند دوسری زبانوں سے ترجمہ کرتے ہوئے الجھ کر رہ جاتے ہیں تو اسی بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ترجمہ کتنا مشکل کام ہے۔ یہاں خوشی کی بات یہ ہے کہ ستار صاحب نے یہ کتاب ترجمہ کرکے بہت بڑا کام کر دکھایا ہے۔ اچھی کتاب کے لئے اچھا مترجم ہی چاہئے۔

کسی اچھی تحریر کو اخبارات کے فائل سے نکالنا اور اس تحریر کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اور پھر بھاگ دوڑ کرکے اس کتاب کا اردو/سندھی مین ترجمہ کروانا اور آخر میں ان ترجموں کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا بھاری بوجھ اٹھانا، ایک طرح سے بہت ہی محنت طلب کام ہے اور توجہ طلب بھی کہ یہ دور ایک لاتعلقی کا سا دور ہے۔ ایسے حالات میں عبدالستار وسطڑو نے یہ سب کچھ کر دکھایا ہے۔ اگر ان کی توجہ اور محنت کو نظرانداز کیا جائے تو پھر تو کچھ نہیں بچتا۔ امید کی جاتی ہے کہ ستار وسطڑو صاحب آگے چل کر بھی اس سلسلے میں بھی کام کرتے ہوئے پائے جائیں گے اس طرح کے نوجوانوں کی اس دور میں بڑی اہمیت بنتی ہے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

باقی فیصلہ تو آفتاب نبی صاحب کی یہ کتاب پڑھنے کے بعد پڑھنے والے ہی کریں گے کہ کس طرح ریسرچ کی ایک کتاب ان کے ہاتھ میں آئی ہے اور کس طرح آفتاب نبی صاحب نے سندھ کی تاریخ کا ایک بہت بڑا باب ہمارے سامنے کھولا ہے۔

عبدالقادر جونیجو

جامشورو سندھ پاکستان

بھیج پگاڑا

آزادی ایک بڑی نعمت ہے دنیا میں بہت ساری مثالیں موجود ہیں جب مختلف قومیں غلامی میں جکڑ جاتی ہیں تو "تنگ آید بہ جنگ آید" کے مطابق چلنا ہوتا ہے جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ظلم اور ناانصافی کی حد ہوگئی تو سندھ سے سورھیہ بادشاہ نے تحریک آزادی میں عملاً" حصہ لیا۔ پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی کو انگریزوں نے گرفتار کرکے بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سورھیہ بادشاہ اپنے وطن کی آزادی اور خودمختاری کے خواہاں تھے اس سلسلے میں انہوں نے حر تحریک شروع کی اور قوم کو جو مشہور نعرے دیئے ان میں دو اہم نعرے "وطن یا کفن" "آزادی یا موت" کے نعرے تھے۔ سورھیہ بادشاہ وہ بہادر سورھیہ سپوت تھے جنہوں نے زندگی کی تمام آسائشوں کو ترک کرکے آزادی کی تحریک چلائی اور انگریز سامراج کے پاؤں مسلم دھرتی سے اکھیڑ دیئے۔ پیر صاحب جس بہادری و بے باقی سے موت کو قبول کیا ان کی بہادری کو دیکھ کر فرنگیوں کے حوصلے پست ہوگئے۔

سورھیہ بادشاہ کے بہادرانہ کردار بابت اور اس کیس کے متعلق کہانیاں سنتے تھے لیکن اس کیس کو کتابی صورت میں لے آنے اور باقاعدہ طور پر پیش کرنا اس ملک کے ایک عظیم شخص محترم آفتاب نبی نے سرانجام دیا ہے۔ میں اس کارنامہ پر انہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ سچ

پڑھنے تو میں ہر جمعہ کو آفتاب نبی کے مضمون کو باقاعدہ طور پر پڑھتا تھا۔ اور پھر دوسرے جمعے کا شدت سے انتظار کرتا تھا۔ مجھے پتہ نہیں تھا کہ آفتاب نبی ایک پولیس افسر ہیں۔ جب پولیس افسر ایسا کارنامہ سرانجام دے وہ بھی ایک بہادر' بے باک' نڈر سورھیہ بادشاہ جیسے انسان کے لئے لکھے ایسے آدمی کو سونے میں تولا جائے تو وہ بھی اس کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔

سورھیہ بادشاہ تو بہادری کے ساتھ سولی پر چڑھ گئے اور آزادی کا نعرہ لگا کر قوم کو بیدار کر کے گئے۔ جب سورھیہ بادشاہ کا ذکر نکلے اور پھر غازیوں شہیدوں سروںچوں' حروں کا ذکر نہیں نکلے تو یہ تاریخ کے ساتھ زیادتی ہوگی۔ جنہوں نے پیر صاحب کے ایک ہی حکم پر اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر میدانوں میں کود پڑے اور سرزمین کے لئے خون کا نذرانہ دیا اور فرنگیوں پر یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں پر حکمرانی کرنا آپ کا کام نہیں ہے یہ وطن ہمارا ہے۔

میں سندھ یونیورسٹی کی انتظامیہ سے کہوں گا کہ وہ فوری طور اس عظیم مجاہد جناب آفتاب نبی کی کوششوں کو سامنے رکھتے ہوئے ان کو پی ایچ ڈی (P.H.D) کی اعزازی ڈگری دی جائے' یہ اس کا حق ہے۔ اس کے ساتھ میں نامور صحافی جناب ستار وسطڑو کو خراج تحسین پیش کرتا ہوں جنہوں نے دن رات ایک کر کے جناب آفتاب نبی کے ان مضمونوں کو ترجمہ کروا کر کتابی صورت میں لائے جو ایک آسان کام نہیں ہے لیکن وسطڑو جیسے نوجوان موجود ہیں تو مجھے یقین ہے کہ وہ آگے بھی اس طرح کی کتابیں لائیں گے۔

ڈاکٹر محمد حسین لغاری

(ٹنڈوالہیار-حیدرآباد)

0221-780082

0300-8370350

اللھم لبیک

سورھیہ بادشاہ اور کورٹ مارشل کے عنوان کے تحت لکھی گئی کتاب سندھ کے اس بہادر مجاہد کے بارے میں معلومات فراہم کرتا ہے جس نے اپنی دولت' آسائش اور اپنی قیمتی اور بہادرانہ زندگی وطن کے ناموس اور آزادی کے جذبے پر قربان کردی۔ درحقیقت انہوں نے انگریز سامراج کو اچھی طرح محسوس کرایا کہ ہندوستان پر بیٹھ کر حکومت کرنا آسان بات نہیں۔

شہید بادشاہ نے موت کو آنکھوں میں آنکھیں ملا کر جس انداز میں آخری دم تک اپنی ہمت اور جوانمردگی کا مظاہرہ کیا۔ اس بات نے اس کو تاریخ کے ان اوراق میں محفوظ کردیا جن میں اسلامی دنیا کے صرف ان شہیدوں کا دکھ لکھا جاسکتا ہے جنھون نے سچائی کے دل کے طور پر "اللھم لبیک" کہا اور اللہ کی راہ میں اس دنیا کی کوئی پروا نہیں کی۔ پاکستانیوں کو چاہئے کہ ماضی کی اس جدوجہد سے سبق حاصل کریں اور سچی آزادی کی کامیابی حاصل کرنے کی خاطر ان کو اپنی منزل کا نشان بنالیں اور اس بات پر فخر محسوس کریں کہ اس دھرتی نے ایسے بے باک اور نڈر انسانوں کو جنم دیا جس کا ذکر کرنے سے ملکی خواہ غیر ملکی عقیدت کے طور پر سورھیہ بادشاہ کا نام سن کر اپنی گردن جھکا لیتے ہیں۔

محترم آفتاب نبی لاکھوں مبارکباد کے مستحق ہیں جنھوں نے ہماری عظیم تاریخ کے سمندر میں کود کر ایسے انمول اور سدا چمک رہنے والے ہیرے موتی نکال کر نئی نسل کو اپنی تحریر کے ذریعے روشناس کرایا۔

کہتے ہیں کہ جس نے ماضی کو بھلایا وہ حال میں بدحال اور مستقبل سے ناامید ہوتے ہیں۔ میرے بھائی (ادا) آفتاب نبی کی ان کاوشوں سے ہم کو حال میں ہمت اور مستقبل میں اجالا دکھایا ہے۔ ان کی اس تحریر سے پاکستان کے لئے محبت ہمارے شاندار ماضی کے شہیدوں کے لئے احترام اور نئی نسل کے لئے ایک رہبر کے جذبے ظاہر ہوتے ہیں۔ سات سمندر دور میری دعا ہے کہ وہ ان جذبوں کے ساتھ آگے بھی لکھتے رہیں اور ہمیں تاریخ علم

کی دولت سے مالا مال کرتے رہیں۔

ہمارا روشن دماغ اور محنتی نوجوان ستار وسطڑو جس نے ہر جگہ اور ہر وقت سچ اور انصاف کے لئے زبان اور تحریروں کے ذریعے جدوجہد کی۔ ان کی بہت ساری کرم نوزایاں جنہوں نے محترم آفتاب نبی کے اس مضمون کو کتابی صورت میں چھپوایا۔ انہوں نے گذشتہ سال مجھ سے امریکہ رابطہ کرکے بتایا کہ آپا سورمیہ بادشاہ پر آفتاب نبی کے مضامین پر مشتمل ویر پبلیکیشن کتاب لا رہی ہے جو دو زبانوں میں ہوگی یعنی اردو اور سندھی، تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اسے پڑھ سکیں۔ ستار وسطڑو دیکھنے میں البیلا جوان لڑکا نظر آتا ہے جب اس کے ساتھ گفتگو کی جاتی ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ایک قوم پرست سماج سدھارک مظلوموں کا ساتھی سارے افراد اکے اندر سما گئے ہیں۔ کاروکاری رسم کے خلاف چار پانچ برس پہلے ان کا ایک مفصل مضمون چھپا تھا اور سرورق (ٹائٹل) پر جو بھیانک اور انسانیت کو شرمانے والی تصویر ان کے میگزین "ویر" میں چھپی اور ابھی اس موضوع کو اس نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ ان کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ جب میں نے میگزین امریکا میں اپنے حلقہ احباب دوستوں کو دکھایا تو بہت سے لوگوں خاص طور پر دو تین امریکیوں کی بے ساختہ چیخیں نکل گئی اور پوچھ رہے تھے کہ کیا یہ آدمی جس نے یہ تصویر جاگیرداری نظام میں رہ کر چھاپی ہیں کیا وہ زندہ ہے؟ میرے خیال میں ستار وسطڑو کسی غیبی طاقت کے سائے میں ہے اور اللہ تعالیٰ اس سے یہ کام لے رہا ہے جو اس کی عمر اور وسیلے رکھنے والے دوسرے افراد کے لئے ممکن نہیں۔

میری دعا ہے کہ ویر پبلی کیشن اور اس کے روح رواں قائم دائم رہیں اور پاکستان کے اس خطے میں لوگوں کو حقیقتوں سے روشناس کرائیں اور نئی نسل کے لئے شعور پیدا کرائیں ایک دفعہ پھر میں آفتاب نبی، ستار وسطڑو کی عمر درازی کے لئے دعا گو ہوں۔

مخلص

ڈاکٹر قمر واحد

ہیشبرگ پنسلوانیہ، امریکہ (USA)

حر تحریک مقاومت _ ایک اجمالی جائزہ

آفتاب نبی

سندھ میں انگریزوں کی ناانصافی کے خلاف حر تحریک مقاومت 1880ء میں شروع ہوئی۔ اس مسلح مقاومت کا سربراہ بچو بادشاہ تھا جس نے طویل جنگ کے بعد خود کو رضاکارانہ طور پر گرفتاری کے لئے پیش کردیا۔ جان کورٹ کری نے اپنی یادداشتوں میں تحریر کیا ہے کہ بچو بادشاہ اور اس کے نائب عیسو کو موت کی سزا دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ ان دونوں کو سانگھڑ میں پھانسی دی گئی کیونکہ یہی جگہ انکی باغیانہ کاروائیوں کا مرکز تھی۔

انگریز انتظامیہ نے بڑی ہوشیاری کے ساتھ ان دونوں کی لاشوں کو ایک شاہراہ کے نیچے دفن کردیا۔ سرایڈمنڈ کاکس بارٹ اس زمانہ میں شکارپور کا ایس پی تھے جنہیں بعد میں حیدرآباد کا ایس پی مقرر کیا گیا اور پھر سندھ کا پہلا ڈی آئی جی بنادیا گیا۔ انہوں نے پولیس اینڈ کرائمز ان انڈیا کے عنوان سے اپنی کتاب تحریر کی تھی جو 1910ء میں شائع ہوئی۔ مذکورہ کتاب میں اس نے اعتراف کیا ہے کہ اگر بچو بادشاہ اور اس کے معاون عیسو کو خفیہ مقام پر دفن نہ کیا جاتا تو اس بات کا قوی امکان تھا کہ ان کے جائے مدفن پر مقبرہ تعمیر کر کے اس کو حروں کے لئے مقدس زیارت گاہ بنادیا جاتا۔

پگاڑا سلسلہ کے پانچویں گدی نشین اور حروں کے پیشوا سید شاہ مردان شاہ کے 1921ء

میں وفات پاجانے کے بعد ان کے فرزند "سید صبغت اللہ شاہ ثانی" چھٹے پیرپگاڑا کی حیثیت سے گدی نشین ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر صرف بارہ سال تھی۔ بعد میں 1920ء کے اواخر عشرے میں پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی اور انگریز انتظامیہ کے درمیان کشیدگی بڑھنے لگی۔ جوان سال پیر صاحب نہایت بہادر اور بے باک انسان تھے۔ پیٹرمین جیسے تبصرہ نگار نے اعتراف کیا ہے کہ پیر سید صبغت اللہ شاہ ایسی پروقار اور متمکن شخصیت کے مالک تھے کہ حر ان کے ہر حکم پر بے چون وچراں جان نثار کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔

رفتہ رفتہ پیر سید صبغت اللہ شاہ اور انگریز انتظامیہ کے درمیان تعلقات بہت زیادہ کشیدہ ہوگئے۔ کمشنر نے پہلے ان کی بندوقوں کے لائسنس منسوخ کئے اور پھر 1930ء میں بغیر لائسنس ہتھیار رکھنے کے جرم میں انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

28 اگست 1930ء میں سکھر کے سٹی مجسٹریٹ مسٹر ادھارام نے انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 344 اور 346 اور آرمز ایکٹ کے تحت اور ابراہیم نامی ایک لڑکے کو صندوق میں محبوس رکھنے کے الزام اور بے شمار ہتھیار اور بارود تحویل میں رکھنے کے جرم میں ان کو آٹھ سال کی سزا دی گئی لیکن ان پر قتل کا الزام ثابت نہ ہوسکا۔ پیر صاحب کو رتناگری جیل میں رکھا گیا۔ انہوں نے کچھ عرصہ مونا پور اور علی پور کی جیلوں میں بھی گزارا۔ یہ وہ وقت ہے جب سندھ بمبئی پریذیڈنسی میں شامل تھا اور مسٹر سائمنگٹن حیدرآباد کے اسسٹنٹ کمشنر تھے۔ جنہیں بعد میں رتناگری کا قائم مقام کلکٹر مقرر کیا گیا تھا۔ وہ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ اس وقت کلکتہ کی علی پور جیل میں انتہا پسند قوم پرست اور بنگالی دہشت گردوں سے پیر صاحب کے روابط پیدا ہوچکے تھے۔ انتظامیہ خاص طور پر اسپیشل برانچ نے پیر صاحب پر 42-1941ء میں ملک دشمن عناصر کے ساتھ تعلقات قائم کرنے کے الزامات عائد کردیئے تھے۔

پیر صاحب اکتوبر 1936ء میں اپنی سزا جس میں حکومت نے رعایت دے دی تھی مکمل ہونے کے بعد سندھ واپس تشریف لے آئے۔ وہ ایک فاتح کی حیثیت میں اسپیشل ٹرین کے ذریعہ سندھ آئے جس کا بندوبست حروں نے کیا تھا۔ ڈاکٹر ایس ایف ڈی انصاری کی کتاب "صوفی سینٹس آف سندھ اینڈ اسٹیٹ پاور" "دی پیرس آف سندھ 1947-1843" کے مطابق انتظامیہ کو اطلاع ملی کہ پیر صاحب نے حروں کو اپنی نجی فوج میں بھرتی کرنا شروع

کردیا ہے۔ اس کے علاوہ آپس کے جھگڑے' فساد کے مقدمات کو نمٹانے کے لئے نجی عدالتیں قائم کرلی ہیں اور لوگوں کو کہا گیا ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی فریاد پولیس اسٹیشن کے بجائے نجی عدالتوں کے سربراہوں کے پاس درج کرائی جائیں۔

1941ء میں پیر صاحب کو حکومت نے کراچی بلوایا اور ان پر کراچی میں قیام کرنے پر دباؤ ڈالا لیکن وہ مختصر عرصے کے قیام کے بعد پھر پیر گوٹھ واپس تشریف لے گئے۔ ان کو پھر کراچی لایا گیا اور ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت انہیں پولیس کی نگرانی میں رہنے پر مجبور کیا گیا۔

حکومت کی طرف سے ایسے پے درپے اقدامات کے بعد خیرپور نوابشاہ اور تھرپارکر کے اضلاع میں تخریب کاری شروع ہو گئی۔ سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا اور کئی لوگوں کو قتل کیا گیا۔ حکومت کے سخت اقدامات کے بعد حروں نے اپنی چھاپہ مار کاروائیوں میں مزید اضافہ کردیا پولیس اور مجسٹریٹوں نے سندھ کی آزادی کے لئے جاری حر تحریک کو مسلح بغاوت کا نام دیکر نو آبادیاتی جبر اور تشدد شروع کردیا۔

مارچ 1942ء کے اوائل میں ایچ ٹی لیمبوک نوابشاہ اور تھرپارکر اضلاع کا اے ڈی ایم مقرر کیا گیا۔ فلپ وڈرف بتاتے ہیں کہ ایچ ٹی لیمبوک کو زیادہ اختیارات دیئے گئے تاکہ وہ عام لوگوں کا اعتماد بحال کر سکے۔

مجموعی طور پر حالات خطرناک حد تک بگڑ چکے تھے۔ قانون کی حکمرانی ختم اور امن وامان ناپید ہوچکا تھا۔ متاثرہ علاقوں میں تعینات پولیس اہلکاروں کا حال اس وقت کے ایس پی اسپیشل ڈیوٹی سانگھڑ اللہ بچایو کے ایک خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ جو انہوں نے 4 اپریل 1942ء میں لکھا تھا اس میں انہوں نے ایس پی تھرپارکر کو مطلع کیا تھا کہ حکومت کی طرف سے پیر صاحب کے اہل وعیال کو تحویل میں لینے اور گڑنگ بنگلے پر بم پھینک کر تباہ کرنے کے بعد حروں نے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر چھاپہ مار کاروائیوں میں تیزی پیدا کردی ہے۔ حر تحریک کی طرف سے دشمنوں کا قتل عام اور سرکاری املاک کو جلا کر راکھ کردینے کی کاروائیاں شدت اختیار کرگئی ہیں۔ سانگھڑ حر تحریک کا مرکز ہے جو ہمیشہ حروں کے خطرات میں گھرا ہوا ہے۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے پاس اتنی پولیس نفری نہیں ہے جو شہر کی اچھی طرح سے ناکہ بندی کرسکے اور نہ ہی سانگھڑ فوجی کیمپ ہے۔ اس شہر میں

پنجاب پولیس کی فقط دو پلاٹون موجود ہیں جن کو میری کمان میں نہیں رکھا گیا ہے۔ وہ مزید تحریر کرتا ہے کہ حروں کے خلاف صحیح طریقے سے کام کرنے کے لئے سانگھڑ پولیس اسٹیشن پر مزید پولیس مقرر کی جائے۔

8 مئی 1942ء میں سندھ کے محکمہ داخلہ کی جانب سے پیر صاحب کے اہل و عیال کے خلاف حکم جاری کیا گیا جس میں پیر صاحب کی بیگمات ان کے دو فرزند سکندر شاہ اور نادر شاہ، پیر صاحب کی دو ہمشیرہ، ان کی خاص کنیز اور گھر کی چار خادمائیں شامل تھیں۔ حکم نامے پر سی بی بی کلی (C.B.B CLEE) کے دستخط تھے جو اس وقت حکومت سندھ کے چیف سیکریٹری تھے۔ شق ڈی (D) کے فقرے (I) کے تحت ملنے والے اختیارات کے مطابق ان لوگوں کو امن عامہ کا دشمن سمجھتے ہوئے وائی۔ ڈبلیو۔ سی۔ اے (YWCA) کے مقابل میر خدا بخش کے بندر روڈ والے بنگلے میں تاحکم ثانی نظربند کر دیا گیا۔"

یہ دوسری عالمی جنگ کا زمانہ تھا۔ کراچی سے لاہور اور وہاں سے جنوب مغربی ہندوستان کی جانب جانے والی اہم ریلوے لائن حر علاقوں سے گزرتی تھی۔ اس وقت کی سامراجی حکومت نہیں چاہتی تھی کہ ریلوے لائن کے قرب وجوار میں تخریبی عناصر موجود ہوں۔ کیونکہ ریلوے کے ذریعہ فوجی سازوسامان کی ترسیل ہوتی تھی۔ ان کے نقطہ نگاہ سے اس قسم کی سرگرمیاں جنگی مقاصد کے لئے نقصاندہ ثابت ہو سکتی تھیں۔ لفٹننٹ مولسورتھ نے حر چھاپہ ماروں کے علاقوں میں کرفیو نافذ کر دیا۔ مئی 1942ء میں اعلان کیا کہ حروں نے ڈر کر ریلوے پٹڑی یا اس کے قرب وجوار میں اپنی چھاپہ مار کارروائیوں میں کمی کر دی ہے اور ریلوے کے عملے کے ساتھ تشدد نہیں کر رہے ہیں۔ لیکن مئی میں حروں نے سیون اپ (7-UP) لاہور میل کو اڈیرو لعل اور ٹنڈو آدم کے درمیان ٹریک سے اتار دیا۔ بیرج (BERRIDGE) کی ایک کتاب "COUPLINGS-UP THE KHYBER" کے نام سے 1969ء میں شائع ہوئی ہے۔ جس میں اس واقعہ کی مزید تفصیل بیان کی گئی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس وقت کے سندھ کے وزیر داخلہ سر غلام حسین ہدایت اللہ کا فرزند مسٹر منور اس ریل حادثے میں مارا گیا تھا۔ 18 مئی 1942ء کے "بمبئی کرانیکل" کی خبر کے مطابق محکمہ ریونیو کے وزیر مسٹر وزیرانی نے ٹرین کے برتھ کے نیچے چھپ کر خود کو بچالیا تھا۔"

سول اینڈ ملٹری گزٹ" نے لکھا کہ ایسا خطرناک واقعہ یا حادثہ سندھ میں اس سے قبل کبھی رونما نہیں ہوا تھا اور اس واقعہ کا براہ راست الزام حر چھاپہ ماروں پر عائد کیا گیا تھا۔ اﷲ منسٹو مہ کنھ جس کی خدمات اس زمانے میں سندھ حکومت کے سپرد تھیں۔ اور جو اس سے قبل فرنٹیئر کانسٹیبلری کا افسر اعلیٰ تھا۔ اس نے اپنی یاداشت میں مذکورہ حادثے کی تفصیل بیان کی ہے اس کا کہنا ہے کہ اس ریل حادثے میں چوبیس مسافر جل کر ہلاک ہو گئے جبکہ بتیس (32) مسافروں کو حروں نے کلہاڑیوں سے مار کر قتل کر دیا تھا۔

انگریز پاکستانی اور ہندوستانی مصنفین نے لکھا ہے کہ 1941ء سے 1943ء تک حروں نے بے شمار چھاپہ مار کاروائیاں کی تھیں لیکن 1890ء سے 1930ء تک کسی بھی مصنف نے حروں کی اس بے چینی کا تجزیہ نہیں کیا ہے جس کی وجہ سے حروں نے انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت کا آغاز کیا تھا۔ کیا حروں کی ایسی کاروائیاں انگریزی پولیس کے تشدد کی وجہ سے رونما نہیں ہوئیں؟ یا انگریزوں نے حروں کو مجرموں کا ایک گروہ تصور کیا تھا؟ ان دونوں نظریات کی حمایت اور مخالفت میں بہت کچھ کہا جاسکتا ہے۔ یہاں ہمیں اس نقطے کی وضاحت کرنا پڑے گی جو مسٹر این۔ اے۔ رضوی نے پیش کیا ہے کہ یہ تصور ہرگز درست نہیں ہے کہ حروں کی چھاپہ مار کاروائیاں پیر صاحب کی درپردہ ہمت افزائی کی وجہ سے عمل میں آئیں۔

جون 1942ء میں نوابشاہ اور تھرپارکر کے اضلاع میں مارشل لاء نافذ کیا گیا اور ایچ۔ ٹی لمبوک کو مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور جنرل مولسورتھ کا مشیر مقرر کیا گیا۔ جنرل مولسورتھ اس وقت کے ہندوستان کے محکمہ قانون کے سیکرٹری کو ان الفاظ میں خط تحریر کیا ہے کہ "مجھے فقط یہ بتایا جائے کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں 'مارشل لاء قانون سے مختلف ہے' مجھے یہ فکر ہے کہ قانون کو قانون سمجھ کر کس طرح استعمال کیا جاسکتا ہے؟" یہ مارشل لاء سندھ میں اس لئے جائز نہیں تھا کہ اس کے احکامات کے تحت سزا یافتہ شخص کو اپیل دائر کرنے کا کوئی حق نہیں تھا لیکن مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو اس کے ذریعہ ایسے خصوصی اختیارات حل کیے تھے کہ وہ مارشل لاء کورٹ کی طرف سے دی گئی کسی بھی سزا کو بحال / کالعدم کرسکتا تھا۔ کسی کی سزا کم یا بڑھا سکتا تھا۔ مولسورتھ خود بھی اس حقیقت کی وضاحت کرتا ہے کہ "

میں مارشل لاء عدالتوں کو سخت سزائیں دینے کا مشورہ دیتا رہتا تھا۔ بحالی کی تصدیق کے لئے یہ فیصلے میرے پاس آتے تھے۔ یہ میری صوابدید پر منحصر تھا کہ سزا یافتہ شخص کے لئے کیسا فیصلہ دوں؟ اگر میری مرضی ہوئی تھی تو اس شخص کو پھانسی پر چڑھانے کا حکم بھی دے دیا کرتا تھا۔
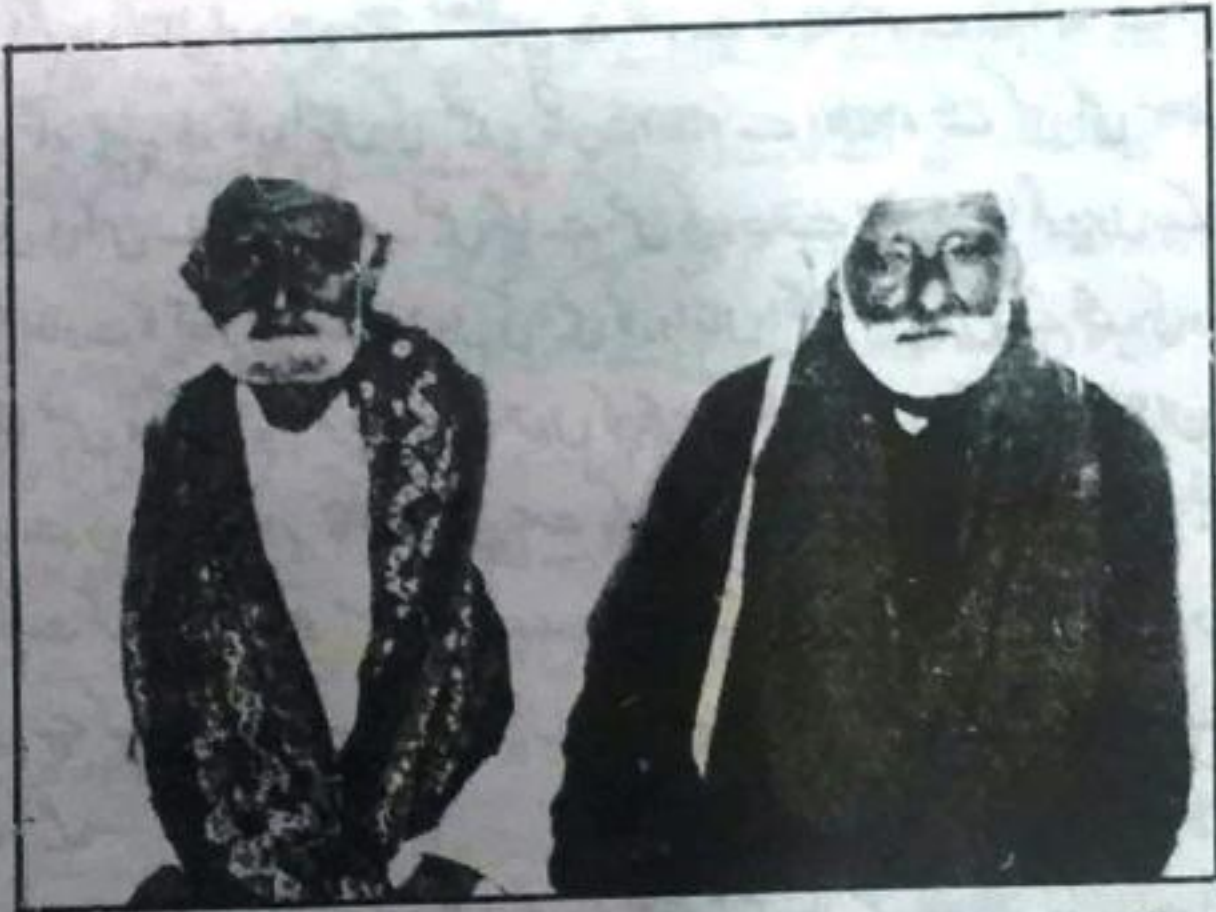
سانگھڑ سے رتنا گری جیل (انڈیا) پیادل جانے والے دو حر مجاہد جو پیر صاحب سے ملاقات کرنے گئے۔

چھاپہ مار جنگ کا منصوبہ

مرکزی اور صوبائی جاسوسی ادارے مثلاً "انٹیلیجنس بیورو" اور سی آئی ڈی کی فائلوں اور رپورٹوں میں پیر صاحب اور سامراجی حکومت کے درمیان موجود کشیدگی کو عجیب وغریب طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔ سندھ سی آئی ڈی کے سربراہ کے آر ایٹس (EATES K.R.) 20 اگست 1942ء کی ایک رپورٹ میں بتاتے ہیں کہ پیر صاحب نے 1936ء میں جیل سے رہائی پانے کے بعد ہنگامہ آرائی شروع کردی تھی۔

بقول ایٹس ایسی ہنگامہ آرائیاں پیر صاحب کے خلاف اہم ثبوت ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں سیاست میں گہری دلچسپی ہے۔ ایک قدیم پیشن گوئی کے مطابق انہیں یہ یقین ہوگیا ہے کہ وہ ایک دن سندھ کے حکمران ہوں گے اور ان کا گاؤں کنگری سندھ کا دارالخلافہ بنے گا۔ ایس پی سی آئی ڈی نے اس حقیقت کا انکشاف کیا ہے کہ عام لوگوں نے یہ بات ذہن نشین کرلی ہے کہ پیرجو گوٹھ پر پیر صاحب کا مکمل کنٹرول ہے۔ اس لئے انہوں نے پولیس کی جگہ اپنی نجی فورس قائم کرلی ہے اور اپنی نجی عدالتیں بھی قائم کردی ہیں۔ لگان کی وصولی کا انتظام وہ خود چلارہے ہیں۔ جاسوسی کا محکمہ اور ویلیج ملیشیا کو بھی منظم کردیا ہے۔ جس میں ان کے مریدوں پر مشتمل چھ ہزار جوان بھرتی کئے گئے ہیں جن کو انہوں نے غازی کالقب عطا کیا ہے۔

سی آئی ڈی نے ان پر یہ بھی الزام عائد کیا کہ وہ مریدوں کی دعوتوں پر جودھپور اور جیسلمیر گئے' جہاں انہیں مریدوں نے ڈیڑھ سو بندوقیں' تین ریوالور اور بے شمار تلواریں نذر کی تھیں۔ سی آئی ڈی کے اہلکار بھی عام طور پر ایسی رپورٹیں ارسال کرتے تھے کہ پیر صاحب حروں کو کہہ رہے ہیں کہ وہ ہر وقت تیار رہیں اور جب بھی ان کے پاس پیر صاحب کا پیغام پہنچے تو وہ اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر پلک جھپکنے سے پہلے جہاد کے لئے پہنچ جائیں۔ وہ وقت قریب آرہا ہے جب وہ سندھ کے بادشاہ ہونے کا اعلان کریں گے اس قسم کی تبدیلیوں کے ساتھ پیر صاحب پر یہ بھی الزام عائد کیا گیا تھا کہ وہ اپنے خلیفوں کے ذریعے مریدوں کو اس حقیقت سے آشنا کر رہے ہیں کہ اس وقت جاری عظیم جنگ کے دوران برطانیہ کو ذلیل شکست ملنے والی ہے اور وہ وقت قریب آچکا ہے کہ جب پیر صاحب اپنے غازی مریدوں کی مدد سے سندھ پر اپنی ایک آزاد حکومت قائم کریں گے۔ اس لئے ان پر فرض ہے کہ وہ ان کے ہر حکم کی بلاچوں وچراں اطاعت کریں۔

ایٹس کو مکمل بھروسہ تھا کہ ان حالات میں حاصل کردہ شہادتوں کی روشنی میں پیش کئے گئے دعوے بالکل ممکن ہیں' جن پر غور وخوض کرنے کی ضرورت ہے۔ ہتھیار اور بارود جمع کرنے کا پیر صاحب پر الزام بھی غور طلب تھا۔ سی آئی ڈی اہلکاروں کو یہ خبر بھی تھی کہ پیر صاحب کے قلعے کے اندر یا ان کی "کیٹی" میں رکھے گئے ہتھیار اور بارود کے علاوہ کسی اور جگہ اسلحہ ذخیرہ کرنے کا علم نہیں تھا۔ اس قسم کی رپورٹس میں یہ حقیقت واضح کی گئی تھی کہ پیر صاحب پر اسلحہ اکٹھا کرنے کا الزام اور اس بات کو ثابت کرنا دو موضوعات مختلف نقاط ہیں۔ اسلحہ کو جمع کرنے کے لئے شواہد اور ان کو کسی جگہ پر بحفاظت رکھنے کے سلسلے میں ثبوت حاصل کرنے کے لئے ایک جامع کوشش کی ضرورت تھی اور ایسی باتوں کا علم فقط پیر صاحب کو تھا۔ ایٹس کا مشورہ تھا کہ پیر صاحب کے قریب کئی ایسے لوگ ہیں جن سے آسانی کے ساتھ اس سلسلہ میں گواہیاں لے جاسکتی ہیں۔ اس کے بعد ہی سی آئی ڈی ان باتوں کو ثابت کرنے میں فتح مند ہوگی۔

سندھ سی آئی ڈی کی فائلوں میں یہ بھی اشارہ ملتا ہے کہ پیر صاحب' جب بنگال کی جیل میں قید تھے تو وہاں موجود بنگالی قیدیوں سے ان کے گہرے مراسم قائم ہوچکے تھے' جو انتہاپسند

اڑیرو لعل اسٹیشن کے نزدیک لعل ھکڑو جہاں لاہور میل گرائی گئی

بشکریہ شرجیل کھرل

قوم پرست تحریک کے حامی تھے۔ جیل سے رہائی کے بعد پیر صاحب کئی نامعلوم لوگوں سے ملاقاتیں کرتے رہتے تھے۔ یہ لوگ ان کے ساتھ کبھی قلعہ (کوٹ) میں اور کبھی کیٹی پر آکر

ملاقاتیں کرتے تھے جن کے متعلق گمان تھا کہ وہ ان کے بنگالی دوست تھے لیکن اس قسم کی ملاقاتوں کے حوالے سے کوئی خاص بات ظاہر نہیں ہوئی تھی۔ ایسے خیالات کو اچھی طرح چھان بین کرکے پرکھنا تھا کہ استغاثہ کے پاس حقیقی ثبوت ہیں یا نہیں۔ اگر ان کے پاس ایسے ثبوت تھے تو ان کو ان ناموں کی نشاندہی کرنے کے لئے کہا جاتا۔ ایٹس کا بیان ہے کہ اسے ایک رپورٹ موصول ہوئی ہے جو ایک گھڑسوار پولیس جمعدار غازی خان نے ارسال کی ہے، اسے گزنگ بنگلے پر تعینات کیا گیا تھا تاکہ وہ پیر صاحب کی مصروفیات کی نگرانی کرسکے۔

جمعدار غازی خان اپنی رپورٹ میں لکھتے ہیں کہ گزنگ بنگلے میں ایک خفیہ راہداری تھی جس کے ذریعہ مشکوک قسم کے لوگ آتے جاتے رہتے تھے اور پیر صاحب کسی پولیس اہلکار کو اس خفیہ راستے کے قریب کھڑا ہونے نہیں دیتے تھے۔

ایٹس اپنی ذاتی رائے دیتے ہوئے آخر میں لکھتا ہے کہ اس حقیقت کی جانچ پڑتال کرکے دیکھنا ہے کہ پیر صاحب واقعی تاج برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کی سازش کا مستحکم ارادہ کرچکے ہیں یا نہیں۔

بحث کا دوسرا نقطہ یہ ہے کہ پیر صاحب سوچ سمجھ کر انتظامیہ کے مختلف اداروں کو ناکام بنانے کی کوشش کررہے تھے یا نہیں؟ خاص طور پر انتظامیہ کا وہ شعبہ جو جرائم پر کنٹرول کرنے اور امن وامان برقرار رکھنے کے حوالے سے ذمہ دار ہے۔ سی آئی ڈی رپورٹوں میں اس بات پر بہت زور دیا گیا ہے کہ "ہمارے پاس ایسی کئی درخواستیں موجود ہیں کہ پیر صاحب نے عام لوگوں کے فیصلوں کو نمٹانے کے لئے اپنے مشیر مقرر کردیے ہیں، جو سرکاری عدالتوں کی جگہ اپنے فیصلے دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں لوگوں کو روکنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کسی بھی جھگڑے کے حل کے سلسلہ میں سرکاری عدالتوں میں معاملہ پیش نہ کریں۔ لگان اور محصول بھی ان کے لوگ وصول کررہے ہیں اور یہ اقدام لوٹ مار کی طرح کا ایک جرم ہے چونکہ قانون انہیں ایسا کرنے کی اجازت ہرگز نہیں دیتا۔

اڈیرو لعل اسٹیشن کے نزدیک گاؤں لعل بکھو کا وہ مقام جہاں ریلوے عملے کو ٹرین گرانے سے پہلے قید کیا گیا

ایس اور غازی خان جیسے سی آئی ڈی کے اہلکار اپنے ماتحت اہلکاروں کی ارسال کردہ رپورٹوں کی بناء پر اس بات پر زور دے رہے تھے کہ پیر صاحب لوگوں کو ورغلا رہے تھے کہ وہ ان کے گاؤں میں موجود پولیس کے اختیارات کو کمزور کرنے کی کوشش کریں اور یہ کہ پولیس کے خلاف من گھڑت شکایات کریں۔ انہیں یہ گمان تھا کہ پیر جو گوٹھ میں پولیس کے خلاف بہت سی شکایات ہیں جو بالکل من گھڑت ہیں یہ اہلکار اس بات کی بھی نشاندہی کرتے ہیں کہ پیر صاحب اکثر اس بات کو دہراتے رہتے ہیں کہ میں مسٹر رے (RAY) اور کے

دینو ہنگورو جسے سیون اپ لاہور میل گرانے کے الزام میں پانچ برس قید کیا گیا (فوٹو چنگل ابڑو)

ایس غلام اکبر کو ابھی تک فراموش نہیں کرسکا ہوں۔ لاہور میل کو ٹریک سے اتارنے والی کاروائی کے متعلق سی آئی ڈی اہلکاروں کا خیال تھا کہ چار حروں کو موت کی سزا دینا ایسے جرائم میں ثبوت کی ایک مثال ہے۔ ان کا نقطہ نظر تھا کہ ان کے اقبال جرم والے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ لاہور میل ٹریک سے اتارنے کا منصوبہ کس ماہرانہ انداز میں تیار کیا گیا تھا اور اس کا مقصد پیر صاحب کو جیل سے رہا کرانا تھا۔

یہاں یہ محسوس ہوتا ہے کہ تمام سی آئی ڈی اہلکاروں کے درمیان اتفاق رائے موجود ہے کہ وہ پیر صاحب کا کسی بھی کاروائی میں براہ راست ملوث ہونا ثابت نہیں کرسکتے کیونکہ وہ اکتوبر سے جیل میں محبوس ہیں۔ لہٰذا انہوں نے غازیوں کی چھاپہ مار کاروائیوں کو ذاتی عمل دخل سے یہ کہہ کر منسلک کردیا کہ پیر صاحب اور غازیوں کے درمیان انگریز حکومت کو تنگ کرنے کا فیصلہ طے ہوچکا تھا۔ گواہوں کو حر چھاپہ مار جنگ کے خلاف گواہیاں دینا آسان

تھیں جو سامنے نظر آرہی تھیں۔ جن کو چھاپہ مار کاروائیوں کے گواہوں اور خود پیر صاحب کے اعلان کردہ دعووں کے ذریعہ بھی ثابت کرنا سہل تھا۔

سی آئی ڈی کے ایس پی نے ایک اہم نقطے کی جانب بھی اشارہ کیا ہے کہ جو ایک قانونی سوال ہے۔ جس کو وضاحت سے بیان بھی کیا ہے کہ جس سوال پر اعلیٰ اختیارات رکھنے والے اہلکاروں کو متوجہ ہونا چاہئے تھا اس لئے کہ پیر صاحب اکتوبر 1941ء سے جیل میں تھے۔ ایس کے مطابق مذکورہ قانونی فقرے کی روشنی میں قانون کا تقاضہ یہ ہے کہ غازیوں نے پیر صاحب کی غیر حاضری میں جو چھاپہ مار کاروائیاں کی ہیں ان کو پیر صاحب کے سر پر تھوپا نہیں جاسکتا ہے اور نہ ہی پیر صاحب کو ان کاروائیوں میں ملوث قرار دیا جاسکتا ہے۔ آخر میں وہ مزید وضاحت کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ ایک قانونی مسئلہ ہے۔ اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اگر استغاثہ پیر صاحب پر یہ الزام عائد کرنا چاہتی ہے تو اسے پہلے قانونی صلاح مشورہ کرنا چاہئے کہ پیر صاحب کی غیر حاضری میں غازیوں کی کاروائیوں کو پیر صاحب کا جرم قرار دیا جاسکتا ہے یا نہیں؟ یا یہ کارروائیاں ان کے تیار کردہ منصوبے کی تکمیل کے سلسلے میں کی گئی ہیں اور کیا یہ سب کچھ انگریز حکومت کو ختم کرنے کے ارادے سے کی گئی ہیں۔ ان کی عدم موجودگی میں ایسی چھاپہ مار کاروائیاں پیر صاحب کی طرف منسوب کرنے کا قانونی جواز ہے یا نہیں؟ اور یہ معلوم کرنے کے لئے کہ اس سازش کی منصوبہ بندی خود پیر صاحب نے کی تھی قانونی وضاحت طلب کرنے کی ضرورت ہے۔

○

پیر صاحب کا نقطہ نظر
سی آئی ڈی کی رپورٹوں کے بارے میں

پیر صاحب نے غازیوں کو بلند حوصلہ عطا کیا تھا جس کی وجہ سے سی آئی ڈی بوکھلاہٹ اور پریشانی کا شکار ہو گئی تھی۔

سندھ سی آئی ڈی کی گذارشات کے علاوہ اس محکمے نے پیر صبغت اللہ شاہ راشدی کے خلاف کئی فائلیں تیار کرلی تھیں جن کی وجہ سے سندھ کی حکومت میں خوف اور تذبذب کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ سی آئی ڈی کی رپورٹیں کچھ تو درست اور کچھ بڑھا چڑھا کر لکھی گئی تھیں اور کئی ایک بے بنیاد تھیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ استغاثہ اور سی آئی ڈی کے مابین گٹھ جوڑ تھا۔ سی آئی ڈی کی یہ رپورٹیں اس لئے نہایت اہم ہیں کہ ان کے ذریعہ یہ پتہ آسانی سے لگایا جاسکتا ہے کہ پیر صاحب کے خلاف برطانوی سامراج کا نقطہ نظر کیا تھا؟ اور انگریزوں کی نظر میں سندھیوں کی کیا حیثیت تھی۔

پیر صاحب کے خلاف سب سے زیادہ اہم رپورٹیں ڈی ایس پی سی آئی ڈی محمد حسین کی نگرانی میں تیار کی گئی تھیں۔ 19 ستمبر 1942ء کی ایک رپورٹ میں وہ بتاتا ہے کہ رتناگری جیل سے ارسال کردہ کتابوں کے ترجمے اور اقتباس زیادہ موثر گواہیاں ہیں، کیونکہ ان کتابوں پر جیل کے سپرنٹنڈنٹ کے دستخط ہیں۔ اس لئے یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ یہ

تحریریں پیر صاحب کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں اور اسے ثبوت کی حیثیت دینا چاہیے۔

پیرو وزیر 1896ء میں انگریزوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ کے دوران شہید ہوگیا تھا۔ محبت پھن اس کی اہلیہ مسماۃ "سونبائی" کا بھائی تھا جسے بیجاپور میں رکھا گیا تھا۔ ان دنوں پیر صاحب جیل میں تھے۔ پیر صاحب نے اپنی ایک کتاب (محبت پھن) محبت کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "محبت ایک سچا مومن ہے۔ وہ بہادر جوان ہے۔ میں اسے منصور کا لقب عطا کرتا ہوں۔ خدا تعالیٰ بھی اسے اسی نام سے پکاریں گے۔ وہ ایک سچا غازی ہے۔ قیامت کے روز وہ میرے ساتھ ہوگا۔" محمد حسین کا بیان ہے کہ محبت فقیر کا پورا خاندان نہایت خطرناک اور جنگجو خاندان تھا۔ اسکی بہن مسماۃ سونبائی کو سندھ سے جلاوطن کرکے بیجاپور میں رکھا گیا تھا اور اسی زمانے میں پیر صاحب جیل میں تھے۔ اس ڈی ایس پی کا بیان ہے کہ پیر صاحب کو جب نظربند کیا گیا تھا تو محبت فقیر اس سے کچھ قبل یا بعد روپوش ہوگیا تھا اور انگریزوں کے خلاف چھاپہ مار جنگ شروع کردی تھی۔ ڈی ایس پی کے بیان کے مطابق پیر صاحب نے اپنی کتاب میں محبت فقیر کی بہت زیادہ تعریف کی تھی۔ وہ بہادر انسان تھا اس لئے اسے منصور اور غازی کا لقب بھی دیا تھا۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب پیر صاحب قید وبند سے آزاد ہوئے تو خود آکر محبت فقیر کی ضمانت دی تھی جس کے بعد وہ بیجاپور سے سندھ لوٹ آیا تھا اور پیر صاحب نے اسے اپنی کوٹھی میں رہنے کے لئے جگہ دی تھی۔ اس کے بعد کے شواہد سے معلوم ہوتا ہے اور جو اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ وہ پیر صاحب کے ساتھ انگریز کی حکومت ختم کرنے کی سازش میں برابر کا شریک تھا۔ محمد حسین مزید بتایا ہے کہ انگریز حکومت کے خلاف پیر صاحب کا رویہ ان کی تحریر کردہ کتابوں سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ پیر صاحب کی جاری کردہ ہدایت نمبر 97 میں تحریر ہے کہ دو تین لاکھ افراد ایسے ہیں جو ہندوستان کی تیس کروڑ آبادی پر حکومت کررہے ہیں۔ یہ اس لئے ہے کہ ہندوستان کے لوگ ڈرپوک ہیں۔ سندھ ہندوستان کا ایک حصہ ہے۔ یہ دو تین لاکھ افراد پر مشتمل انگریز کی فوج ہے اس حقیقت کو ضرور یاد رکھا جائے۔

سی آئی ڈی کا ڈی ایس پی مزید لکھتا ہے کہ پیر صاحب نے اپنے مریدوں کو چھاپہ مار جنگ

لڑنے کی تیاری کرنے کے سلسلے میں اپنی ارسال کردہ ہدایت نمبر 68 میں اس طرح ہدایت کی ہے کہ "اپنے پاس ہتھیار رکھنا ایک بہادر انسان کی نشانی ہے اس لئے کہ ہتھیار اپنے پاس رکھنے سے دل زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے اور ہتھیاروں سے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ لاٹھی اور کلہاڑی بھی ایک قسم کا ہتھیار ہے۔" اس کے بعد پیر صاحب نے جو کچھ بھی کیا اسے زیر بحث لایا گیا ہے' اس طرح اسلحہ کو جمع کرنے والے عمل کو ان کی تحریروں کے ساتھ موازنہ کیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ پیر صاحب رتنا گری جیل میں رہ کر بھی اس بغاوت اور چھاپہ مار جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے اسی دوران قید چھاپہ مار جنگ کی تیاریوں میں مشغول تھے۔ محمد حسین آگے چل کر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ پیر صاحب نے اپنے مریدوں کے حوصلے بلند کرنے کے لئے ہدایت نمبر 65 جاری کی تھی جس میں وہ غازیوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "دشمن کو آرام کرنے کا موقع نہ دیا جائے۔ موقع ملتے ہی اسے ختم کر دو۔ اسے کبھی بھی زندہ نہ چھوڑو۔ اگر آپ اسے معاف کر دیتے ہیں تو یہ دوسری بات ہے۔"

سی آئی ڈی اہلکار کا خیال تھا کہ یہ پیر صاحب کی ذمہ داری ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ان سطروں کو تحریر کرتے وقت ان کا ارادہ یہ نہیں تھا۔ سی آئی ڈی اہلکاروں کے مطابق پیر صاحب نے جس مقصد کے لئے یہ سطور تحریر کی تھیں اس کا انہیں مکمل ادراک تھا اگر سطور کو تحریر کرتے وقت کوئی دوسرا مقصد تھا تو وہ حقیقت ثابت کرنے کی ذمہ داری قبول کریں۔

محمد حسین نے پیر صاحب کی تحریروں کے متعلق ایک دوسرے نقطہ نظر کا اظہار کیا ہے۔ سی آئی ڈی اہلکاروں کو یہ بھی اعتراض تھا کہ پیر صاحب نے اپنے مریدوں کو جنونی جنگجو بنانے کے لئے اپنی کتاب کی ہدایت نمبر 130 میں یہ الفاظ تحریر کئے ہیں کہ "یہ جہان ہر ایک کو مر کر چھوڑنا ہے' لہٰذا اس دنیا کو عزت اور وقار سے چھوڑنے کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صحیح معنوں میں شہید ہو کر مرے' جو شخص موت کے خوف سے چھپ کر کونے میں بیٹھ جاتا ہے' موت اسے وہاں بھی آگھیرتی ہے' جو شخص بہادر ہے اور اپنے دشمن سے لڑتا ہے اور مر جاتا ہے تو اسے ہم مرا ہوا نہیں کہیں گے کیونکہ اس کی بہادری کی وجہ سے اس کا نام قیامت

تک قائم ودائم رہے گا۔"

ڈی ایس پی پیر صاحب کی اس قسم کی تحریروں پر تبصرہ کرتے ہوئے متعجب ہو جاتا ہے کہ پیر صاحب نے آخر کس ارادے کے تحت اس قسم کے الفاظ لکھے ہیں؟ ان کا دشمن کون ہے؟ آخر یہ چھاپہ مار جنگ جرمنی کے خلاف لڑنے کے لئے تو نہیں ہے، جس میں لڑتے لڑتے یہ جنونی جنگجو شہادت کا رتبہ حاصل کرلیں گے؟ محمد حسین کا خیال ہے کہ پیر صاحب اپنے "دشمن" کے متعلق اس طرح سے سوچ رہے تھے۔ اس کا خیال ہے کہ اس سوال کا ایک ہی جواب ہے کہ جب پیر صاحب نے 1931ء میں ایسی کتاب تحریر کی تو اس وقت جنگ کا سوال ہی نہیں تھا۔ محمد حسین مزید لکھتا ہے کہ اس زمانے میں جرمنی پیر صاحب کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا اور نہ ہی اس وقت ان کا کوئی دوسرا دشمن تھا۔ اس لئے ان کے جیل سے رہائی پانے تک مریدوں کا شہید ہوتے ہوئے دیکھنے کا مقصد یہ تھا کہ بعد میں کسی دشمن سے بڑی جنگ لڑیں گے۔ انہوں نے ایسا کر بھی دکھایا۔ ایسی گواہی واقعات سے بھی مل سکتی ہے۔ اس مرحلے پر پہنچ کر پولیس کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ اس بات پر زور دیتا ہے کہ ایسے مقصد کے متعلق پیر صاحب نے خود تحریر کیا ہے، اس کو واضح کرنے کی ذمہ داری سی آئی ڈی پر نہیں خود پیر صاحب پر ہے۔ اس کا دعویٰ ہے کہ ایسی تحریریں بغاوت کا حصہ ہیں کیونکہ ان کا اس کے علاوہ اور دوسرا مقصد ہرگز نہیں تھا۔ یہ پیر صاحب کی ذمہ داری ہے کہ ثابت کریں کہ ایسی تحریر لکھتے وقت ان کا مقصد اس کے سوا کوئی دوسرا تھا۔

سی آئی ڈی رپورٹیں مزید بتاتی ہیں کہ جب 1936ء میں پیر صاحب دکن جیل میں قید تھے تو وہ اپنے پیغام کتابوں کی جلدوں کے اندر یا اخباروں میں چھپا کر مریدوں کو روانہ کیا کرتے تھے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک صندوق کے اندر اکاون کتابیں اور رسالے تھے جو جنوری 1935ء میں سندھ کی سی آئی ڈی کو ملے تھے۔ ان کتابوں اور رسائل کی جانچ پڑتال کے بعد معلوم ہوا کہ ان کو ملی ہوئی اطلاع بالکل درست تھی، سی آئی ڈی کے اہلکار اس مواد کے ملنے کے بعد سوچ رہے تھے کہ جب پیر صاحب دکن جیل میں تھے تب وہ انگریز سرکار سے سخت نفرت کا اظہار کر رہے تھے اور ان کے نظریات سیاسی اور باغیانہ تھے۔ سی آئی ڈی کے اہلکاروں نے اس حقیقت پر بھی روشنی ڈالی ہے کہ پیر صاحب نے منتخب اسمبلی کے اراکین

پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ "یہ بے وسیلہ اور لاچار ہیں' ایسے اراکین سے عوام کو آخر کون سا فائدہ حاصل ہوگا۔ اے مسلمان آنکھ کھول۔ آپ لوگ اس غلامی میں کتنا وقت گزاروگے؟ ایسے کئی مسلمان ہیں جو اپنے خون کو پانی سے زیادہ اہم نہیں سمجھتے ہیں۔ آج آپ اپنے گریبانوں میں جھانک کر دیکھو اور سوچو کہ اسلام کتنا کمزور ہوچکا ہے۔"

خفیہ رپورٹوں سے یہ بھی عندیہ ملتا ہے کہ ایک مرتبہ پیر صاحب نے لکھا کہ "انگریزوں کی حکومت ہندوستانیوں کو گدھا سمجھ کر ان پر انگلینڈ کا بوجھ لاد رہی ہے۔" دوسری مرتبہ یوں تحریر کرتے ہیں کہ "ہم ہندوستانیوں کی حالت ایک غلام جیسی ہے۔ ہمارا نان نفقہ اور ہمارے گریبان یورپی لوگوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اے ہندوستان کے باشندو اس قسم کی ذلیل زندگی سے تو موت بہتر ہے۔ ہم اتنے ذلیل و خوار ہیں کہ دوسرے ممالک میں ایسا سلوک کسی ڈاکو اور قاتل سے بھی نہیں کیا جاتا۔"

دوسری جگہ مثنوی کی ایک کتاب کے خالی صفحہ پر لکھتے ہیں کہ "اس کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اپنی دھرتی کو آزاد کرانے کے لئے اپنی زندگی تر قربان کردینے کے لئے تیار ہوں۔"

———○———

لیمبرک کی حکمت عملی

انگریز سرکار کی جانب سے پیر صاحب کو پھانسی دینے کا فیصلہ

اپریل 1942ء میں حروں کے علاقوں میں امن و امان کی صورت حال بہت زیادہ بگڑ چکی تھی اور پولیس جرائم پر قابو پانے میں ناکام ثابت ہو چکی تھی۔ ماہ مئی 1942ء کے دوران سندھ انتظامیہ کے ایک انگریز اعلیٰ افسر نے اس مسئلے کے حل کے سلسلے میں بڑی جانفشانی کی تھی اور اندازہ لگایا گیا تھا کہ برٹش راج کے نقطہ نظر سے اس خطرناک ماحول سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے سید صبغت اللہ کو پھانسی دینا ضروری ہے۔ 1982ء میں سندھ کوارٹرلی کے ایک شمارے میں شائع ہونے والے اپنے مضمون میں میجر جنرل وصال محمد نے اشارتاً یہ بات بتائی ہے کہ اس وقت کے اعلیٰ اختیارات کے حامل افراد یہ سوچ رہے تھے کہ حکومت کے پاس دو راہیں کھلی ہوئی ہیں ایک راہ یہ ہے کہ پیر صاحب سے گفتگو کر کے انہیں امن و امان قائم کرنے کے لئے آمادہ کر کے آزاد کر دیا جائے یا ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر پھانسی دے دی جائے اور اس طرح ان سے نجات حاصل کی جائے۔ وصال محمد کے خیال کے مطابق پہلی راہ پر چلنا ان کی توہین کے مترادف ہے اس لئے انہوں نے یہ راہ اختیار نہیں کی۔ وہ پیر صاحب کو پھانسی دینے کے حامی تھے اور ایسے ہی خیالات کی حمایت

کرنے لگے تھے۔ بالآخر یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔

اب پیر صاحب کو پھانسی دینے کے مسئلے پر اتفاق رائے پیدا کرنے کی کوششیں شروع کردی گئیں تھیں۔ اہم مسئلہ یہ تھا کہ ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ کس نوعیت کا ہونا چاہئے اور اسے کس طرح شروع کیا جائے؟ اس معاملے سے متعلق حروں کے موضوع پر ایک دلچسپ اور خفیہ نوٹ لیمبوک کے دستاویزات کے مجموعے میں برٹش لائبریری میں موجود ہے۔ اس نوٹ کی تمہید ان الفاظ سے ہوتی ہے جب تک پیر صاحب زندہ ہیں اس وقت تک حروں کی چھاپہ مار کارروائیوں کو روکنا ناممکن ہے۔ ایچ ٹی لیمبوک اس بات پر متفق ہے کہ عام لوگ توہمات کا شکار ہوچکے ہیں اور ان کے ذہن میں یہ بات جاگزیں ہوگئی ہے کہ انگریز کا قانون پیر صاحب کا بال بھی بیکا نہیں کرسکتا۔ وہ کشف و کرامات کے مالک ہیں۔ وہ اس نقطہ نظر پر زیادہ زور دے رہا تھا کہ پیر صاحب نے سندھ اور انگلینڈ کے عوام سے غداری کی ہے اس کے علاوہ وہ اخلاق کی حامل باتوں سے بھی دور ہیں۔ لیمبوک اپنی سوچ میں صحیح تھا کہ سندھ میں اچھے لوگوں کا قحط ہے اور وہ پیر صاحب کی وفات پر خوش نہیں ہوں گے۔

اس کے نقطہ نظر کے مطابق انگریزوں کی روایت یہ رہی ہے کہ آہستہ آہستہ آگے بڑھنے سے کامیابی یقینی ہوجاتی ہے۔ لیکن اس کا کہنا ہے کہ گذشتہ تین سال کے عرصے کے دوران ہونے والے واقعات سے محسوس ہورہا تھا کہ تیز رفتاری کا مقابلہ فقط تیز رفتاری ہی سے کیا جاسکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر دیر ہوگئی یا اس معاملے کو نمٹانے میں نااہلی کا ثبوت دیا گیا تو اس کے نہایت ہی خطرناک نتائج برآمد ہوں گے۔ یہ بات کسی سے بھی پوشیدہ نہیں رہی تھی کہ فوج اور پولیس میں خلیج بڑھ رہی ہے۔ فوج نے پولیس کی کارکردگی کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کارروائیوں کا سارا نظام غیر یقینی کیفیت کا شکار ہوگیا تھا۔ اس کا پہلے سے قائم کردہ طریقہ کار یہ تھا کہ ایس پی صورت حال کے متعلق پوری معلومات آئی جی پولیس اور ڈی آئی جی پولیس کو دیتے تھے لیکن حروں کی چھاپہ مار کارروائیوں کی وجہ سے صورت حال گمبھیر ہوگئی تھی اس لئے پولیس کمشنر کی ایک نئی آسامی پیدا کی گئی تھی تاکہ جاسوسی کے نظام کو مزید بہتر بنایا جاسکے۔ اس نئے عہدے پر مسٹر

فریڈرک ینگ کو مقرر کیا گیا جو اس سے قبل صوبہ یو پی کے ڈی آئی جی تھے۔ اس کی وجہ سے پولیس کے انتظام میں نہ فقط غیر یقینی کی کیفیت اور الجھاؤ پیدا ہو گیا تھا بلکہ اس کے ماتحت پولیس اہلکار اور آئی جی اور ڈی آئی کی نگرانی میں کام کرنے والے ریگولر پولیس فورس کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی تھی۔ لیمبوک نے سوچا کہ اس قسم کی نا اتفاقیوں کو ختم کرنے کے لئے ان عہدیداروں کے درمیان اجلاس ضروری ہیں کیونکہ انگریز افسروں میں شخصی انانیت زیادہ تھی جو ناقابل معافی تھی۔ لیمبوک ہر گھڑی اس بات پر زور دے رہا تھا کہ حروں کی چھاپہ مار کارروائیوں کو اس وقت جاری عظیم جنگ کے پس منظر میں دیکھنا چاہئے۔ اس کا نقطہ نظر تھا کہ اس عظیم جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے ہر ایک کو متحد ہو کر کام کرنا چاہئے اور انگریزوں اور ہندوستانیوں بلکہ سب لوگوں کو یکجا ہو کر کام کرنا چاہئے۔ لیکن اہم مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ پیر صاحب پر جو الزامات عائد کئے گئے تھے وہ مارشل لاء کے نفاذ سے پہلے کے تھے۔ یہ بنیادی قانونی سوال تھا جس سے بچنے کے لئے ایک منفی راہ اختیار کی گئی تھی جس کا حقیقت سے واضح طور پر انکار تھا۔ لیمبوک کا خیال تھا کہ حروں کی چھاپہ مار کارروائیوں کو "ایک تنظیم کی کارروائیاں" تسلیم کیا جائے اور اسے ایک "مسلسل عمل" کے طور پر قبول کیا جائے۔ اس کے بعد مارشل لاء اتھارٹی کو اس تنظیم کے خالق پر ملٹری کورٹ میں مقدمہ دائر کرنے کا ایک قانونی جواز مل جائے گا۔ اس نے مذکورہ حکمت عملی کی تجویز اس طرح پیش کی تھی کہ حروں کی چھاپہ مار جنگ نے حکومت کو مارشل لاء کے نفاذ کے لئے مجبور کر دیا ہے اس لئے ایسی کارروائیوں کو ایک شخص کی انفرادی کارروائی اور الگ الگ عمل سمجھنا نہیں چاہئے۔ ایسی کارروائیوں کو ایک منظم تحریک کی مشترکہ سرگرمی سمجھنی چاہئے۔ اس نے پر زور سفارش کی تھی کہ اگر اس حقیقت کو تسلیم کر لیا جائے تو وہ اعتراض دور ہو جائے گا کہ مارشل لاء کے نفاذ سے قبل والے مقدمات مارشل لاء قانون کے تحت نہیں چلائے جا سکتے اور پیر صاحب پر اس نوعیت کے مقدمے ملٹری کورٹ میں چلانا غیر قانونی عمل ہو گا۔ اس کے خیال کے مطابق ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جی او سی اور اپر سندھ مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مختلف نوعیت کے قانونی ضوابط نافذ کرنا ہوں گے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ مارشل لاء کا ضابطہ نمبر 52 اس کے بعد ہی

جاری کیا گیا تھا جس کا مقصد تھا کہ مارشل لاء کے نفاذ سے قبل کے جرائم کو مارشل لاء کے ضوابط کے تحت نمٹایا جا سکتا ہے۔

سندھ کی حکومت نہایت سنجیدگی سے غور کر رہی تھی کہ پیر صاحب کو سزا کس طرح دی جا سکتی ہے؟ اس مسئلے پر "سول لاء" اور "مارشل لاء" کے نقطہ نظر سے غور کیا گیا تھا' ایسا طریقہ کار بہت الجھا ہوا تھا۔ انہیں شک تھا کہ وکلاء ایسے قانونی نقاط اٹھائیں گے جن کا ہر طرف چرچا ہو جائے گا اس کے علاوہ کچھ ایماندار اور باضمیر جج بھی رکاوٹ بن جائیں گے۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے کہ اگر پیر صاحب ان مقدمات سے بری ہو گئے تو ہمارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا اور ہم اس قسم کے نقصان کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ لیمبرک کے مطابق مارشل لاء کے طریقہ کار کے ذریعہ اس مضبوط چٹان کو توڑا جا سکتا تھا اس کا خیال تھا کہ اگر اس کے ہاتھ پیر صاحب کی گردن تک پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو سندھ میں مارشل لاء کے نفاذ سے کچھ بھی حاصل نہیں ہو گا بہرحال مارشل لاء کے بعد ہر شے تبدیل ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر ایف ایس ڈی انصاری بتاتے ہیں کہ ایسی گمبھیر صورت حال میں پیر صاحب پر غداری اور بغاوت کا الزام عائد کرنے کا قوی امکان تھا اور اس جرم کی سزا موت ہے۔ مقدمے کے اہم گواہ سرکاری ملازمین تھے اس لئے سزا کا امکان مزید روشن تھا۔

لیمبرک سے متعلق سرکاری کاغذات میں ایسے کچھ خطوط موجود ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ حکومت کے اعلیٰ افسران بھی اس بات کے حامی تھے کہ پیر صاحب پر جلد مقدمہ چلا کر بغیر وقت ضائع کئے پھانسی دے دی جائے۔ 5 جون 1942ء میں سندھ حکومت کے سیکریٹری نے لیمبرک کو لکھا کہ کئی ایک حلقوں نے پیر صاحب کو پھانسی دینے کا مشورہ دیا ہے جس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنا لازمی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ پیر صاحب کو بذریعہ جہاز واپس سندھ لایا جائے اور ان کے خلاف مقدمے کی کارروائی شروع کر دی جائے۔ ان کو فوراً پھانسی ملنی چاہئے۔ اعلان کیا جائے کہ انہیں 5 جولائی 1942ء کو گرنگ بنگلے کے نزدیک پھانسی دی جائے گی۔ اس کا خیال تھا کہ پیر صاحب کے مرید یہ اعلان سن کر اپنے مرشد کی آخری زیارت کے لئے ضرور آئیں گے۔ اگر حکومت کی یہ چال کامیاب ہو جاتی

ہے تو کوئی حر بغیر کسی مشکل کے گرفتار کئے جاسکتے ہیں۔ اس نے لیمبوک کو مشورہ دیا تھا کہ وہ پیر صاحب کے پاس جاکر انہیں کہے کہ بڑی بندوقیں سرکار کو پیش کی جائیں اگر وہ اس پر عمل کرنے سے انکار کریں تو دونوں صورتوں میں ان کو پھانسی دے دی جائے۔ سیکرٹری نے لیمبوک سے گذارش کی کہ ایسی تجویز ضرور ان کے سامنے رکھی جائے۔

اس طرح 5 دسمبر 1942ء کے تحریر کردہ ایک خط سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب کو پھانسی دینے کے لئے پوری انتظامیہ نے اتفاق رائے سے فیصلہ صادر کردیا تھا۔ اس تاریخ کو مسٹر برنارڈ نے پیٹر کارگل کو لکھا کہ حروں کی چھاپہ مار کارروائیاں اس وقت تک ختم نہیں ہوں گی جب تک پیر کو پھانسی پر چڑھایا نہیں جاتا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ایک نیا مقدمہ تیار کیا جارہا تھا۔ مسٹر ریڈ کا خیال تھا کہ پیر صاحب کو پھانسی دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جنگجو حر سمجھیں گے کہ پیر صاحب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں اس لئے مزید جدوجہد عبث ہے۔ پیر کو پھانسی دینے کے بعد مریدوں میں ایک قسم کا طیش پیدا ہوگا اور ان کی چھاپہ مار کارروائیاں عروج پر پہنچ جائیں گی اور انتقام کے لئے آنکھیں بند کرکے ہتھیلیوں پر رکھ کر میدان میں نکل آئیں گے۔ اس کا خیال تھا کہ جب تک حروں کی چھاپہ مار کارروائیاں جاری ہیں اس وقت تک مارشل لاء کو نافذ رکھا جائے۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ پیر صاحب پر مارشل لاء قوانین کے مطابق مقدمہ چلانے کے بعد پھانسی دینے میں کچھ وقت صرف ہوگا کیونکہ مقدمہ چلانے کی تاریخ کا ابھی تعین نہیں ہوا ہے۔ وہ اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ مذکورہ بیان کردہ آراء اس بات کی متقاضی ہیں کہ ان پر بغیر وقت ضائع کئے عمل درآمد ہونا چاہئے۔ اس لئے پھانسی دینے کا عمل جلد پایہ تکمیل کو پہنچنا چاہئے اور یہ کام مارشل لاء کے خاتمہ سے دو ماہ قبل مکمل ہوجانا چاہئے یا مارشل لاء کو ختم کرنے کے لئے تجویز کردہ مدت کو تھوڑا آگے بڑھایا جائے اور پھانسی دینے اور مارشل لاء ختم کرنے کے درمیان کافی فاصلہ ہونا چاہئے۔ پیر صاحب کو پھانسی دینے کے لئے فقط ضلعی افسران میں اتفاق رائے نہ تھا۔ ڈاکٹر انصاری کے خیال کے مطابق حروں کی صورت حال پر 8 اگست 1942ء کو "وائسرائے ہاؤس" میں ایک اجلاس ہوا جس میں غور کیا گیا کہ ایسا مقدمہ درج کیا جائے جو پیر صاحب کو کسی بھی صورت میں پھانسی کی سزا مل سکے یہ نہ صرف فقط سندھ

حکومت کے اعلیٰ افسران کا نقطہ نظر تھا بلکہ وائسرائے سیکرٹریٹ کے اعلیٰ افسران بھی اس سزا کے کٹر حامی تھے کہ پیر صاحب کو کسی بھی صورت میں پھانسی کی سزا ملنی چاہیے۔ وائسرائے کی معلومات کے لئے مسٹر آر این بل کرائنٹس نے اپنی طرف سے ایک رپورٹ تیار کی جس پر سر گلبرٹ ولس نے اپنے قلم سے تبصرہ تحریر کیا تھا۔ جس سے عندیہ ملتا ہے کہ انگریز افسر پیر صاحب کو پھانسی کی سزا دینے کے لئے بہت بے چین تھے۔ وہ اپنی ذاتی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "اگر مقدمے میں پیر کو پھانسی نہیں ملتی ہے تو اسے کالے پانی کی سزا دے دی جائے۔"

ای۔ ایچ ہولٹ جو پیر صاحب کو پھانسی کی سزا دینے کا سخت حامی تھا

1938ء میں چارلس بیوپری بنل کلی سندھ میں بطور چیف سیکریٹری مقرر ہو کر آئے جو سی آئی ای اور آئی سی ایس تھے۔ وہ پانچ فروری 1893ء میں پیدا ہوئے۔ کیمبرج سے تعلیم کی۔ انڈین سول سروس کا امتحان پاس کیا اور 4 اکتوبر 1919ء میں بمبئی کے اسسٹنٹ کلکٹر مقرر کئے گئے جلد ترقی ملی اور 1925ء میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر انفارمیشن مقرر کردیے گئے۔ جنوری 1933ء میں بمبئی حکومت کے داخلی ایکلیے سٹیٹسٹکل محکمہ کے سیکرٹری کے عہدے پر فائز رہے۔ 1942ء میں اسے چیف سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ ایڈورڈ ہارلینڈ ہولٹ 21 اپریل 1907ء میں پیدا ہوئے۔ آکسفورڈ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اکتوبر 1931ء میں بحیثیت اسسٹنٹ کلکٹر سول سروس کا آغاز کیا۔ 1942ء تک کراچی' حیدر آباد' نواب شاہ اور دادو اضلاع کا کلکٹر اور ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ رہا اس سے قبل اسے سندھ حکومت میں سیکرٹری بھی مقرر کیا گیا۔

1942ء میں حروں کی چھاپہ مار جنگ کے دوران ہولٹ سکھر کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھا۔

پیر صاحب کی پھانسی کو قانونی شکل دینے کے متعلق بہت غور دخوض کیا جارہا تھا۔ سندھ کے کچھ افسران نے پیر صاحب کو پھانسی دینے کی شدید سفارش کی تھی۔ ایسی صورت حال

ایک خفیہ نوٹ سے بھی واضح ہو جاتی ہے جو سکھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ای ایچ ہولٹ نے سندھ کے چیف سیکرٹری سی بی بی کلی کو 23 مئی 1942ء میں تحریر کیا تھا۔ اس نوٹ کی ایک نقل لیمبوک' ڈی سی بارٹی اور ڈی بی ٹی جج کو بھی روانہ کی گئی تھی۔ یہ نوٹ برٹش لائبریری میں لیمبوک سے منسوب سرکاری کاغذات میں موجود ہے۔ ہولٹ اپنی نسلی برتری کے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہوئے دعویٰ کرتا ہے کہ حر نہایت وحشی اور جنگلی لوگ ہیں۔ نفسیات کے ماہرین کے خیال کے مطابق "وحشی قسم کے افراد جنونی فطرت کے لوگ ہوتے ہیں اور ان کا حقیقت سے کوئی بھی واسطہ نہیں ہوتا۔" وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے مزید بتاتا ہے کہ "اب حروں کو عقل و ہوش میں لانے کی ضرورت ہے۔ ان کا علاج پولیس کے ساتھ خونی مقابلوں کے ذریعہ یا پیر کو پھانسی دینے سے کیا جا سکتا ہے۔"

ہولٹ کا خیال ہے کہ مذکورہ پہلی حکمت عملی پر عمل کرنا دشوار ہے چونکہ انتظامیہ خود کئی مقامات پر محفوظ نہیں ہے اب تو گاؤں کو تحفظ دینا بھی ممکن نہیں رہا ہے جہاں آبادی کا ایک بہت بڑا حصہ رہائش پذیر ہے وہ افسوس کا اظہار بھی کرتا ہے کہ ہندو بھی پیر صاحب کی آزادی کے لئے دباؤ ڈالیں گے اور وزراء کے لئے اس قسم کا دباؤ برداشت کرنا مشکل ہو جائے گا۔ ہولٹ کی سوچ کے مطابق پیر صاحب کی جیل سے رہائی کسی ہسٹریا کے مریض کو منہ پر تھپڑ مارنے کے بجائے پیار اور خوشامد کرنے کے مترادف ہوگا۔ صورتحال کے نقطہ نظر سے سکھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کا خیال تھا کہ پیر صاحب کو بغیر وقت ضائع کیے پھانسی کی سزا دی جائے۔ ہولٹ کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر پیر صاحب پر مقدمہ چلانا ضروری ہے تو اس کے لئے گواہ سرکاری افسران ہوں گے۔ لیکن ان سے اس قسم کی گواہی بند کمرے میں لی جائے اس کے ساتھ ہی وہ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ ایک خصوصی آرڈیننس نافذ کرکے پیر پر مقدمہ چلایا جائے۔ اسے یہ بھی احساس ہے کہ اس کا مشورہ انصاف کے ساتھ ایک مذاق ہے اس لئے وہ پھر اس بات پر زور دینا شروع کر دیتا ہے کہ اس کا یہ نقطہ نظر انصاف کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا کیونکہ پیر صاحب کی جاں بخشی سے سینکڑوں بے گناہ افراد لقمہ اجل بن جائیں گے اور یہ کام درست نہیں ہے۔

سکھر کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ یہ دعویٰ بھی کرتا تھا کہ اگر پیر صاحب اور اس کے فرزند کو

پھانسی دی گئی تو حر اپنی چھاپہ مار کارروائیاں ختم کردیں گے۔ خطرناک چھاپہ مار کارروائیوں سے اچھی طرح نمٹا جاسکتا ہے اگر پورے سندھ میں ایسی کارروائیاں مسلسل اور آہستہ آہستہ جاری رہیں تو ان سے نبرد آزما ہونا مشکل ہوجائے گا۔ ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سامراجی حکومت کا ایک اعلیٰ افسر پیر صاحب کے بے گناہ بیس سالہ فرزند کو پھانسی دینے کے متعلق سوچ رہا ہے جس کا جرم فقط یہ ہے کہ وہ والد کے بعد ان کی جگہ مسند نشین ہوں گے جو مستقبل میں انگریز انتظامیہ کے لئے دردسر بن سکتا ہے۔

ہولٹ اس نقطے پر زور دیتے ہوئے کہتا ہے کہ دنیا اب جنگ عظیم کے شکنجے میں ہے اس لئے انتظامیہ اپنی طاقت اس مسئلے پر صرف کرنا نہیں چاہتی کہ حروں سے بچاؤ کے لئے ہر جگہ مسلح دستے مقرر کرتی رہے۔ اگر پیر کو پھانسی دی گئی تو قید میں بند مشہور حر چھاپہ ماروں کو بھی پھانسی دینا ضروری ہوجائے گا۔ پیر صاحب کو پھانسی دینے کی تیاریاں زور و شور سے جاری تھیں اور یہ سمجھا جارہا تھا کہ یہ عمل جنونی حروں کے منہ پر طمانچہ رسید کرنے کے مترادف ہوگا۔ آخر میں ہولٹ اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتا ہے کہ اسے پورا یقین ہے کہ "حکومت اپنے ملازمین اور سندھ کے لوگوں کو پیر سے نجات دلانے سے انکار نہیں کرے گی۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ انڈین سول سروس اور پولیس کے انگریز افسران کا پیر صاحب کو پھانسی پر لٹکانے کے متعلق نقطہ نظر وہی تھا جو ایچ ٹی لیمبوک کے خط سے بھی واضح ہوتا ہے کہ "میں آپ کے خیالات سے بالکل متفق ہوں لیکن میں سرکاری سطح پر ان اقدامات کا مشورہ نہیں دے سکتا ہوں جن کی آپ نے پرزور سفارش کی ہے کیونکہ مجھے خدشہ ہے کہ اس صورت حال کی راہ میں "قانونی شہادت" ایک رکاوٹ بن جائے گی۔

30 مئی 1942ء کو ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سکھر اپنے 23 مئی کے تحریر کردہ خط میں پیر صاحب کو پھانسی دینے کی ضرورت کو مزید واضح کرتا ہے اور وہ قبل از وقت کئی اقدام اٹھانے کا مشورہ دیتا ہے اس کا خیال ہے کہ پیر صاحب کو پھانسی دینے سے قبل حر علاقوں میں مزید فوج بھیج دی جائے۔ ایسے ضروری اقدامات مئی کے آخر میں اٹھائے گئے تھے اس کا نقطہ نظر تھا کہ "حروں نے یہ ساری مصیبت پیر کو آزاد کرانے کے لئے پیدا کی ہے۔"

ہولٹ اس بات پر بھی زور دیتا ہے کہ سندھ کی صوبائی اور ہندوستان کی مرکزی حکومت

اس مصیبت کو ختم کرنے کے لئے ہوشیاری سے کام کررہی ہے اگر یہ مسئلہ حل ہوگیا تو حر پھر کبھی اپنی باغیانہ کارروائیاں نہ کرسکیں گے لیکن یہ مقصد اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا ہے جب تک پیر زندہ ہے اور اس کے خلفاء پیر جو گوٹھ میں موجود ہیں۔ وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ فوج نے ریلوے ٹریک کے ساتھ ساتھ گشت کیا' اور اپنی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کیا۔ جرائم میں کچھ کمی آئی اور پھر فوج یہاں سے واپس چلی گئی۔ اس کے بعد حالات پھر حسب سابق ہوگئے اور حروں نے نئے سرے سے اپنی چھاپہ مار کارروائیاں شروع کردیں۔ اسے خطرہ ہے کہ یہاں کے مقامی باشندوں کو یہ سب کچھ معلوم ہے وہ سب کچھ دیکھ رہے ہیں اور حروں کی سوچ بھی یہی ہے۔ یہاں کے مقامی لوگ اور حر سرکاری اہلکاروں سے ڈرتے ہیں اس لئے ہولٹ یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ اگر اس مصیبت کی جڑیں کاٹ دی گئیں تو یہ زہر آلود پودا اپنی شاخیں نکالنا بند کردے گا۔

ہولٹ کا خیال ہے کہ اس کے علاوہ دوسرے بھی کئی مسائل ہیں۔ سکھر میں موجود فوج اس مشورے کے انتظار میں تھی کہ وہ اپنی کارروائیاں کس جگہ اور کس طریقے سے شروع کرے۔ یہ ایک مشکل سوال ہے اس لئے مشورہ آسانی سے نہیں دیا سکتا۔ حر چھاپہ ماروں کے جتھے ہر جگہ گھوم پھر رہے ہیں۔ وہ مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہوجاتے ہیں اور ہر ایک ٹولہ اپنے طور پر کارروائیاں کررہا ہے وہ کئی علاقوں میں پھیل گئے ہیں اور ان علاقوں پر کنٹرول رکھنے کے لئے ایک بریگیڈ فوج کی ضرورت ہے۔ یہ بھی گمان ہے کہ کئی ایک گاؤں میں حروں کو پناہ دی گئی ہے۔ ایسے گاؤں کا گھیراؤ کیا جاسکتا ہے لیکن زمینداروں کی فراہم کردہ اطلاعات پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے علاوہ یہ مسئلہ بھی ہے کہ فوج کو دشمن سے دوبدو مقابلہ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے لیکن یہاں حر چھاپہ مار کارروائیاں کررہے ہیں اس لئے وہ اس قسم کی جنگی کارروائیاں نہیں کرسکتے۔

ابتدائی مرحلے میں کرنل ٹامکنسن نے سکھر کی انتظامیہ سے استفسار کیا تھا کہ کیا انتظامیہ اس کے زیر کمان "ہیوی مشین گن" یا "لائٹ مشین گن" کی حامل فوج استعمال کرسکے گی؟ ہولٹ کا خیال تھا کہ ضلع سکھر کے لئے اس نوعیت کا سوال غیر مناسب تھا کیونکہ حر چھاپہ مار کارروائیاں کررہے تھے ان کی چھاپہ مار کارروائیوں سے نمٹنے کے لئے فوج نبرد آزمائی نہیں

کر سکتی تھی۔ ہولٹ کا خیال تھا کہ اگر حر ایک جگہ جمع ہو کر لڑیں گے تو اس صورت میں ٹامکنس کی "ہیوی اور لائٹ گنیں" کامیاب ہو سکتی ہیں۔ لیکن وہ گومگو کی کیفیت کا شکار تھا۔ حروں کا ایک جگہ جمع ہو کر فوج سے لڑنے کا خیال ایک خام خیال تھا۔ حروں کو ایک جگہ جمع کرنے کا فقط ایک ہی امکان تھا کہ یہ اعلان کیا جائے کہ پیر صاحب کو پیر جو گوٹھ میں پھانسی دی جائے گی ساتھ میں یہ اعلان بھی کیا جائے کہ پیر صاحب کے "کوٹ" یعنی قلعہ کو آگ لگا کر زمین بوس کردیا جائے اور ان کی مقدس پگڑی، تسبیح اور عما مبارک کو بھی تباہ کردیا جائے۔ اس نوعیت کے اعلان سن کر ہزاروں کی تعداد میں حر پیر جو گوٹھ میں پہنچ جائیں گے اور فوج کو "ہیوی اور لائٹ مشین گنیں" چلانے کا سنہری موقع مل جائے گا۔ اگر وہ حروں کو مارنے میں کامیاب نہیں ہوئے تو اس کے خیال کے مطابق پیر کو پھانسی دے کر پیر پرستی جیسی روایت کو نابود کیا جاسکے گا۔ ہولٹ کو یہ بھی گھمنڈ تھا کہ وہ حروں کے دلوں میں سے پیر کی عقیدت کو ختم کرنے میں کامیاب ضرور ہوگا۔

ایسی حکمت عملی کو مدنظر رکھتے ہوئے اس نے مشورہ دیا تھا کہ حکومت کو سندھ میں امن و امان قائم کرنے کے لئے کچھ سوچنا چاہیے۔ یہ بھی سوچا گیا کہ یہاں طویل المعیاد اور مہنگی فوجی کاروائی عمل میں نہیں لائی جائے۔ ہولٹ کا بیان ہے کہ حکومت پیر صاحب کو پھانسی کی سزا دینے سے خوفزدہ تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سندھ سے باہر مسلم ممالک میں اس کا رد عمل ظاہر ہو۔ اس کی رائے کے مطابق حروں کی چھاپہ مار کاروائیوں کو سندھ سے باہر زیادہ شہرت حاصل ہو رہی تھی جبکہ سندھ کے اخبارات اور اطلاعاتی ادارے خاموش تھے کیونکہ ایسی خبروں پر سندھ میں شدید قسم کی پابندی عائد کی گئی تھی تاکہ حروں کے بارے میں کوئی خبر شائع نہ کی جائے۔ ہولٹ نے حروں کے معاملے میں سخت موقف اختیار کیا تھا اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کی مرکزی حکومت کے پاس نہ اتنی فوج ہے اور نہ ہی ہتھیار اور بارود کہ وہ جاپان کے خلاف جنگی کاروائی کے ساتھ ساتھ حر چھاپہ ماروں کے خلاف بھی علیحدہ فوجی مورچہ کھول سکے۔

آخر میں وہ سندھ کے چیف سیکریٹری سی۔ بی۔ کلی کو لکھتا ہے کہ سندھ حکومت کو اس کی رائے سے آگاہ کیا جائے۔ اسے یہ یقین تھا کہ اس نے جو کچھ تحریر کیا ہے اس پر سندھ

حکومت اور ہندوستان کی مرکزی حکومت ضرور غور کرے گی۔ اس کے علاوہ اس کا یہ بھی خیال تھا کہ اس کی تحریر کردہ سفارشات کہیں دوسرا رخ اختیار نہ کرلیں۔ وہ چیف سیکریٹری کی طرف ارسال کردہ خط کے ساتھ ہی فوج اور سندھ انتظامیہ کو بھی اپنی رائے سے متفق ہونے پر آمادہ کررہا تھا اس نے اس حقیقت سے لمبیو ک ڈی۔ بی۔ ٹی۔ جج۔ آئی۔ پی ایس پی سکھر' ای ای ڈیوز' ڈی سی بارٹی' کرنل لینگٹن او سی بریگیڈ حیدر آباد اور تھرپارکر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے۔ بی عبدالقادر کو بھی آگاہ کیا تھا۔
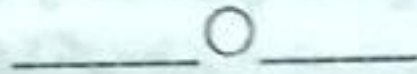
آپ جام شہادت کا پیالہ پینے کے بعد سینٹرل جیل حیدرآباد میں کرسی پر آرام فرما رہے ہیں ۲۰ مارچ ۱۹۴۳

مقدمے سے قبل کی حکمت عملی

لمبورک کی فائلوں میں ایک نجی خط کا دلچسپ اقتباس موجود ہے، جو سکھر کے ڈسٹرکٹ جج ای جی ویلس کو اپریل 1941ء میں لکھا گیا تھا۔ ویلس 41-1940ء کے عرصے میں تین مرتبہ کراچی گیا تھا اور تینوں مرتبہ گورنر سے ملاقاتیں کیں تھیں۔ گورنر نے اس سے کہا تھا کہ پیر کو مارنے کے لئے پولیس کو ٹارگٹ دے دیا گیا ہے اور وہ اسے شکار کرنے کے لئے مسلسل کوششیں کر رہی ہے۔ گورنر نے اسے یہ بھی بتایا کہ پولیس جب پیر صاحب کو دیگر جرائم میں گرفتار کرنے میں ناکام ہوئی تھی تو ان کو آرمی ایکٹ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ ویلس نے گورنر کا حوالہ دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ پیر صاحب کو معصوم اور مظلوم سمجھ رہے ہیں۔

لمبورک کی خط و کتابت پڑھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ کی انتظامیہ استغاثہ کے گواہوں کے اہم کردار ادا کرنے سے مکمل طور پر باخبر تھی۔ ضلعی انتظامیہ نے ان گواہوں کو خوش رکھنے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا تھا۔ اعلیٰ حکام اہم گواہوں کو آزادانہ طور پر گھومنے پھرنے نہیں دیتے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات پر اس لئے پابندی عائد کی گئی تھی کہ کہیں وہ حروں کے نرغے میں نہ آجائیں لیکن اصل خوف یہ تھا کہ کہیں وہ بیرونی دباؤ میں آکر سرکار کے فائدے میں گواہی دینے سے دستبردار نہ ہو جائیں۔ استغاثہ کے ایسے

گواہوں کو ایک جگہ قید کر کے ان پر اسپیشل پولیس کے اہلکاروں کو تعینات کر دیا گیا تھا۔ راشن وغیرہ بھی ضلعی انتظامیہ ان کو فراہم کرتی تھی۔ یہ اسی طرح تھا جس طرح قیدی مجرموں کو خوراک دی جاتی ہے لیکن یہ راشن زیادہ نہیں ہوا کرتا تھا جس سے وہ خوش ہو جائیں اس لئے ان کے ملازمین کو اجازت دی تھی کہ وہ ان کے لئے کھانا وغیرہ تیار کریں۔

استغاثہ کے ایسے گواہوں کو یہ امید ہو چلی تھی کہ انگریز سرکار ان کو گواہی کے صلے میں زرعی زمین بطور انعام دے گی۔ 25 فروری 1943ء کو حیدر آباد کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے اس موضوع کا حوالہ دیا تھا۔ 2 مارچ 1943ء کو سکھر کے کلکٹر ای ایچ ہولٹ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ پیر صاحب کے خلاف دائر کردہ مقدمے میں سلطانی گواہوں کو شہری علاقوں میں رعایتی نرخوں پر پلاٹ دیے جائیں گے لہٰذا ان شہروں کے نام اور اراضی کی تفصیل سے مطلع کیا جائے۔

کچھ حساس فائلیں ایسی بھی تھیں جو استغاثہ کے مقدمے کو کمزور کر رہی تھیں۔ چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کے سول مشیر پیٹر کارگل نے مسٹر لمبوک کو خط روانہ کیا جس میں قطعی حکم دیا گیا تھا کہ کسی بھی حالت میں مسٹر کورن اور کوٹھاوالہ کے درمیان ہونے والی خط وکتابت یا مختلف محکموں کی طرف سے ایک دوسرے کو ارسال کردہ فائلیں عدالت میں پیش نہ کی جائیں اگر پیر اس طرح کے سرکاری کاغذات کا مطالبہ کریں تو متعلقہ محکمہ اس قسم کی اجازت گورنر سے طلب کرے اور ایسے دستاویز دینے سے انکار بھی کیا جا سکتا ہے۔ وہ تبصرہ کرتے ہوئے مزید بتاتا ہے کہ ایسے صوابدیدی اختیار فقط ہزایکسلنسی کے پاس ہیں اور کسی دوسرے کے پاس نہیں ہیں۔

انگریز حکومت یہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی تھی ایسا کوئی موقع فراہم کرنے کے لئے تیار نہ تھی پیر صاحب کے خلاف ایسا مقدمہ تیار کرنا تھا جس سے ان کو سو فیصد سزا ملنے کا امکان ہو۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسے گواہ ہونے چاہئیں جو اپنی بات پر ڈٹے رہیں اور مقدمہ کی پوری کارروائی کے دوران استغاثہ کے ساتھ شانہ بشانہ کھڑے ہوں۔ ایسے گواہ وہ ہو سکتے ہیں جو پیر کو اس کے روبرو سب کچھ کہہ جانے والے ہوں اور حروں کے

خوف وڈر کو خاطر میں لانے والے نہ ہوں۔ اس صورتحال میں وہ افراد آگے آسکتے ہیں جو پیر کے دشمن ہوں یا پاتھاریدار قسم کے افراد ہوں۔ ایسا ایک شخص پی کے بی P.K.B تھا۔ اس کا اصل نام اس لئے نہیں دیا گیا ہے کہ کہیں حرا سے یا اس کے خاندان کو تہس نہس نہ کردیں اس کے خلاف جرائم کی ایک لمبی فہرست تھی اور جرائم کی تفتیش کی وجہ سے پولیس ہمیشہ اس کے پیچھے رہتی تھی اس کے خلاف عدالتوں میں بھی کافی مقدمے زیر سماعت تھے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے سول مشیر کے اسٹاف آفیسر نے تحریر کیا ہے کہ پی کے بی P.K.B نہایت اہم اور کارآمد گواہ بن سکتا ہے لیکن سکھر میں بیان دینے کے بعد اسے کوہین اور نیوکے نے جلد گرفتار کرلیا۔

حیدرآباد کی مارشل لا انتظامیہ کے لئے پی کے بی نہایت اہم گواہ تھا جس نے اس کام کے علاوہ بہت سارے دیگر کام بھی انجام دیے تھے۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے سول مشیر کے دفتر نے محسوس کیا کہ جس ڈاکے کے جرم میں وہ ملوث تھا اس میں دراصل وہ مجرم نہیں تھا۔ آخر اس سے کیا سلوک کیا جاسکتا تھا لیکن نیت یہ تھی کہ اس سے ہمدردی حاصل کی جائے اور مدد بھی۔ اس کے علاوہ اختیارات کے حامل افراد کو اس کی مزید حفاظت کرنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اس طرح گرفتاریوں کی وجہ سے دوسرے گواہان پر نہایت خراب اثر ہوا۔ اس لئے اسٹاف آفیسر نے ضروری سمجھا کہ ان پر جو مقدمے درج ہیں وہ سب خارج کئے جائیں۔

حیدرآباد کے ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر نے 26 جنوری 1943ء کو سکھر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک خط ارسال کیا کہ پی کے بی نے صحیح طور پر گواہی دی ہے لہٰذا اسے بری کردیا جائے اس خط میں مزید تحریر کیا گیا تھا اس کی ٹھوس گواہی کی وجہ سے اس سے ماضی میں سرزد ہونے والے جرائم معاف کردیے جائیں لیکن اگر وہ مستقبل میں کوئی جرم کرے گا تو اس کا وہ خود ذمہ دار ہوگا۔ سکھر کے ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کارگل نے 29 جنوری کو حیدرآباد کے ڈپٹی مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو ایک خط روانہ کیا کہ سکھر کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر ہولٹ کو کہا جائے کہ اس پر دائر مقدمہ خارج کیا جائے کیونکہ یہ اختیار اس کے پاس ہے۔ اس کے علاوہ مسٹر کارگل نے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے سول مشیر کو بھی

ایک خط ارسال کیا جس میں اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ چونکہ پی کے بی مطلوبہ گواہی دے رہا ہے اس لئے اس پر عائد مقدمے ختم کیے جائیں۔ اس پر مسٹر لیمبوک نے اس کو لکھا کہ "شرط یہ ہے کہ وہ اپنی گواہی ٹھوک بجا کر دے۔"

ایم ایچ M.H کے بارہ عزیزوں کو کچھ عرصہ پہلے کسی گواہی کی پاداش میں گرفتار کیا گیا تھا۔ (ایم ایچ کا نام اس لئے خفیہ رکھا گیا کہ کہیں حراس کے خاندان کو گزند نہ پہنچائیں) جو ایک وقوع پذیر ڈاکے کے گواہ تھے۔ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اسٹاف آفیسر کو مقدمے کے غلط یا درست ہونے کا علم نہیں تھا۔ اس نے سکھر کے ڈپٹی کمشنر کو تحریر کیا کہ استغاثہ پر دباؤ ڈالنا مصلحت کے خلاف ہے۔ اس نے بتایا کہ اگر ان میں سے ایک بھی گواہ کسی وجہ سے اپنی گواہی سے مکر جائے تو نقصان کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اس لئے ایسا کوئی کام نہ کیا جائے۔ اگر ایم ایچ یا اس کا بھائی اس معاملے میں لچکدار رویہ رکھتے ہوں تو اس کے غیر اہم عزیزوں کو گرفتار کرنے سے اس کی تلافی نہیں ہو سکتی ہے اس نے اپنے خط میں مقدمہ خارج کرنے کی تاکید کی تھی۔

1982ء کے "سندھ کوارٹرلی" میں میجر جنرل وصال محمد کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں اس نے لکھا ہے کہ پیر صاحب کے خلاف مقدمہ کی تیاری کے دوران استغاثہ کے گواہوں کو فوجی بیرکوں میں رکھا گیا تھا اور جھوٹی گواہی دینے کے لئے ڈی ایس پی سیمول غنی ان کی تربیت کرتا رہتا تھا۔ کیونکہ اس کی پیر صاحب کے خلاف ذاتی دشمنی تھی۔ وصال محمد کا خیال ہے کہ ایک اطلاع موصول ہونے پر اس نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور ممنوعہ علاقوں میں داخل ہو گیا تھا۔ ایسا کرنے کی اسے کوئی قانونی اجازت نہیں تھی۔ وہاں پہنچ کر اس نے ایک مجرم کو ثبوت کے ساتھ گرفتار کر لیا جو اس وقت ایک شرمناک فعل میں مصروف تھا۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ ڈی ایس پی نے ایسی رپورٹ فورس کمانڈر بریگیڈیئر لینگ لینڈز کو دی اور یہ رپورٹ سیموئل غنی کے گلے پڑ گئی۔

مقدمہ کی کارروائی سے پہلے سازش اچھی طرح تیار کرنے کے باوجود بھی یہ مقدمہ بہت کمزور تھا۔ جنرل رچرڈسن کا خیال تھا کہ مقدمہ کی کارروائی اس وقت تک شروع نہ کی جائے جب تک یہ یقین نہ ہو جائے کہ پیر صاحب کو اس کے ذریعے سزا مل سکتی ہے۔ اس دوران

کئی شکوک پیدا ہو چکے تھے اس لئے کہ جاسوسی رپورٹوں کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا کہ گواہی دینے سے گواہ کترا رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حروں نے ہر طرف چھاپہ مار جنگ کی آگ بھڑکا دی تھی۔ دیگر یہ کہ کچھ گواہوں کے دلوں میں ایسے شکوک جاگزیں ہو گئے تھے کہ حر انگریز فوج سے زیادہ طاقتور ہیں۔ مسٹر ڈاؤ نے 16 جنوری 1943ء کو رچرڈسن کو ارسال کردہ اپنے ایک خط میں انگریزوں کی کامیابی کے متعلق شک کا ذکر کیا تھا اس کا خیال تھا کہ پیر صاحب کے خلاف دائر کردہ مقدمہ ناکام ہو جائے گا کیونکہ جب مقدمہ کی کاروائی شروع ہو گی تو استغاثہ کے گواہ اپنے بیانات سے پھر جائیں گے۔ یہ بات دل میں رکھتے ہوئے ڈاؤ کا خیال تھا کہ یہ نہایت ضروری نظر آرہا ہے کہ اگر پیر صاحب پر مقدمہ ثابت نہیں ہوتا ہے تو اسے افریقہ کی طرف جلاوطن کیا جائے۔

لیمبورک کے خطوط سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انتظامیہ کی مرضی تھی کہ پیر صاحب کو ہوائی جہاز کے ذریعے واپس سندھ لایا جائے 5 جنوری 1943ء کو اس پر عمل کیا گیا۔ میجر جنرل وصال بتاتے ہیں کہ ایک دن ان سے کہا گیا کہ وہ دن کے ڈھائی بجے حیدر آباد کے ہوائی اڈہ پر ڈپٹی فورس کمانڈر سے ملاقات کریں اس نوعیت کا حکم بڑا عجیب وغریب تھا اور وہ ٹہلتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کون سا کھیل کھیلا جائے گا۔ آخرکار جب وہ مقررہ مقام پر پہنچا تو دیکھا کہ وہاں بریگیڈیئر لینگ لینڈس اور فریڈرک ینگ ہوائی اڈہ پر پہلے سے موجود تھے۔ فریڈرک ینگ نے اسے بتایا کہ وہ پیر پگارا کا استقبال کرنے آئے ہیں جو ناگپور سینٹرل جیل سے یہاں پہنچنے والے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد پیر صاحب جہاز سے اترے اور انہیں بذریعہ ویگن حیدر آباد لے جایا گیا ویگن کے آگے اور پیچھے بیشمار فوج تھی۔

___O___

مقدمہ کی کارروائی پہلے سازش کی تیاری

جنوری 1943ء کے اوائل میں پیر سید صبغت اللہ شاہ راشدی کو بتایا گیا کہ ان کے خلاف عدالتی تحقیقات جنوری کی 29 تاریخ سے شروع ہوگی۔ انھیں یہ بتایا گیا کہ اس تاریخ پر مقدمہ کی کارروائی ضرور شروع ہوگی اور تمہارے وکلاء کا یہ عذر خاطر میں نہیں لایا جائے گا کہ وہ مقدمہ کے سلسلے میں تیاری نہیں کر سکے ہیں۔ اس پر پیر نے جواب دیا کہ اگر انصاف مقصود ہے تو یہ مقدمہ جلد بازی میں نہیں چلایا جائے اور انھیں ایک اچھے بیرسٹر کی خدمات حاصل کرنے کی مہلت دی جائے۔ پیر صاحب نے گزارش کی تھی کہ وہ اپنے دفاع میں محمد علی جناح کو اپنا وکیل بنانا چاہتا ہے۔ میجر جنرل وصال محمد بتاتے ہیں کہ پیر صاحب نے یہ بھی استفسار کیا تھا کہ ہندوستان میں ایسا کوئی مسلمان وکیل ہے جو ان کے دفاع کے لئے آمادہ ہوسکے۔ انگریز حکومت نے ان کی یہ درخواست اس بہانے سے رد کردی کہ "ڈینل مل" نامی ایک مقامی وکیل ہے جسے اس کا وکیل مقرر کیا گیا ہے۔ پیر صاحب پر انڈین پینل کوڈ کی دفعہ 121-A کے تحت مقدمہ چلایا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ مارشل لا کے ضابطہ کے مطابق اس جرم کی زیادہ سے زیادہ سزا موت تھی۔ مقدمہ حیدرآباد جیل میں چلایا گیا۔ مین اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس مقدمہ کی کارروائی مارشل لاء کے تحت بند کمرے میں ہوئی۔

لیفٹیننٹ جنرل مولسورتھ نے حر بغاوت والے علاقوں میں کرفیو نافذ کر کے یہ اشارہ دیا تھا کہ پیر صاحب کو اپنے دفاع کے لئے ہر قسم کی سہولت دی گئی ہے۔ برٹش لائبریری میں موجود دستاویزات میں اس مقدمہ کے متعلق کوئی معلومات نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ انہیں تھار کھ کران پر ہر قسم کا خوف وحراس پیدا کیا گیا تھا۔ اس سے انگریز حکومت کا مقصد یہ تھا کہ وہ کسی بھی حالت میں اپنے دفاع کے لئے ایک اچھے بیرسٹر کی خدمات حاصل کرنے میں ناکام ہو جائیں۔ ان کی منقولہ اور غیر منقولہ املاک اور نقد رقوم اور مریدوں کی طرف سے جمع کردہ رقوم بھی حکومت نے ضبط کرلی تھیں تاکہ وہ کسی اچھے وکیل کی خدمات حاصل نہ کرسکیں۔ ڈینئل مل وکیل نے 28 جنوری 1943ء کو میر خدا بخش خان تالپور کو ایک خط تحریر کیا کہ خریدی گئی تمام چاندی بھی حکومت نے ضبط کرلی۔ الاہنسٹر مکتھ نے فوج' فرنٹیئر کانسٹیبلری کے دستے اور پولیس کے چھاپوں کا تفصیلی ذکر کیا ہے جس میں وہ بتاتے ہیں کہ ایسی کارروائی چاندی کی اینٹوں اور دوسری املاک ہتھیانے کے لئے کی گئی تھی۔ پیر جو گوٹھ میں پیر صاحب کے گوداموں کو ڈائنامائٹ سے اڑا دیا گیا تھا کچھ عرصہ تک انکم ٹیکس کے افسران نے بھی بہت پریشان کیا۔ ان کے وفادار مریدوں کو بہت ڈرایا دھمکایا گیا۔ لاتعداد حروں کو "پری وینٹیو ڈیٹنشن قانون" کے تحت گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ ان میں سے کئی ایک کو ڈیفنس آف انڈیا قانون کے تحت جیل بھیج دیا گیا۔

مسٹر لانگ مین پیر صاحب کا جیلر تھا۔ 14 جنوری 1943ء کو مسٹر ڈیئل مل وکیل نے جیل جاکر پیر صاحب کے ساتھ مقدمے کے متعلق گفتگو کی۔ اس وقت مسٹر لیمبوک وہاں موجود تھے اس دوران پیر صاحب کو بتایا گیا کہ ان کے خلاف یہ الزام ہے کہ انہوں نے تاج برطانیہ کے خلاف جنگ کرنے کی تیاری کی ہے اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے وہ 1937ء سے 1941ء تک جیسلمیر کا دورہ کرتے رہے ہیں۔ مسٹر ڈینئل مل یہ جاننا چاہتے تھے کہ جاسوسوں کی ایسی رپورٹوں کے باوجود بھی انہیں وہاں جانے سے کیوں نہیں روکا گیا تھا؟

استغاثہ نے اس سوال کے متعلق یہ دلیل دی کہ پیر صاحب نے حکومت کو ختم کرنے کے لئے غازیوں پر مشتمل فوج منظم کی تھی۔ اس بات سے انکار کرتے ہوئے ڈیئل مل نے کہا کہ انہوں نے حکومت کی مدد کے لئے غازی بھرتی کیئے تھے۔ ہتھیاروں کے بارے میں پیر

صاحب نے یہ دلیل دی کہ ان کے پاس ہتھیاروں کے لائسنس موجود ہیں لہٰذا یہ قانون کی خلاف ورزی نہیں ہے۔

ایسی فائلیں اوریجنل اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں جن کے ذریعہ ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ ڈیکل مل وکیل اس بات کو واضح کرنا چاہتے تھے کہ نوابشاہ ضلع کی انتظامیہ پیر صاحب کے مریدوں کے خلاف جھوٹے مقدمات دائر کرنے کی تیاری کر رہی ہے۔ علاوہ ازایں پولیس سانگھڑ پے گڑنگ بنگلے کے آس پاس گشت کرکے حروں کو خوفزدہ کر رہی ہے۔ کچھ عرصے کے بعد اس بنگلے کو تہس نہس کردیا گیا تھا۔ وکیل نے ان کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا کہ پیر صاحب حروں کی طرف سے کئے گئے جرائم کے ذمہ دار نہیں ہیں۔ ان افراد نے حکومت کے خلاف بغاوت اس لئے کی ہے کہ حکومت نے پیر صاحب کے اہل وعیال کی توہین کی ہے گڑنگ بنگلے کو جلاکر راکھ کردیا گیا ہے۔ پیر صاحب کے اہل وعیال کو ان کے مخصوص گھر سے نکال کر کراچی میں بندر روڈ پر واقع ایک دوسری جگہ پر نظربند کردیا ہے۔ یہ کاروائی سندھ حکومت کے محکمہ داخلہ کے حکم نمبر 41/XIII-H(S) مورخہ 8 مئی 1942ء کے تحت کی گئی تھی۔ وہ مزید بتاتے ہیں کہ ایسی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی کہ کسی پیر کے اہل وعیال کو اس طریقے سے کسی مکان میں محبوس کردیا گیا ہو۔

اس کے علاوہ ڈیکل مل نے یہ نکتہ بھی اٹھایا کہ انتظامیہ نے گڑنگ کو تباہ کردیا تھا جو ایک گاؤں سے متصل پیر صاحب کے رہنے کا صدر مقام تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس نقطہ پر بھی زور دیا تھا کہ حروں نے اس لئے بغاوت کی تھی کہ سندھ حکومت کے سیکریٹری نے توہین آمیز کام انجام دیئے تھے۔ حروں کے خیال وتصور اور عقیدت کے نقطہ نگاہ سے ان کا ہر فعل ان کے دین' خداوند تعالیٰ اور پیر صاحب کی ہدایت کے مطابق ہے۔ اور ان کو وہ اپنی نجات کے لئے ایسے ضروری سمجھتے ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ اس سے قبل بھی پیر پگاروں کی زندگی میں حروں کا وہی طرز عمل رہا ہے' جو انہوں نے 1940ء میں کیا ہے اور کسی بھی پیر نے کبھی بھی سندھ کے بادشاہ بننے کی کوشش ہرگز نہیں کی ہے۔ یہ ایسے نقاط ہیں جن کا اپنا ایک اہم تاثر ہے اور ایک اہم مسئلے سے مربوط ہیں لیکن ان کو غیر ضروری سمجھ کر رد کردیا گیا۔ ڈیکل مل نے اس بات پر بھی زور

دیا تھا کہ حروں کی بود وباش ان کا مزاج، طبیعت، اعتقاد اور بہادری یہ تمام وہ حقائق ہیں جو اس نازک اور اہم مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں ان سب کا تعلق اس مقدمے سے ہے لیکن بد قسمتی کی بات یہ ہے کہ "سول ایڈوائزر" درست اور مناسب قسم کے مسائل کو مختلف درجات میں تقسیم کرتا ہے اس کا مقصد مقدمے کو زیادہ طول دینا ہے یا پھر اسے غیر ضروری سوال سمجھتا ہے۔

یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں۔ پہلی بات یہ تھی کہ حکومت سندھ کا زیادہ سے زیادہ اعتماد سی آئی ڈی کی رپورٹوں پر تھا۔ اس نقطہ نظر سے یہ بتانا مناسب ہوگا کہ کبھی کبھار ایسی رپورٹیں اسپیشل برانچ بھی دیتی تھی جنہیں صورتحال کو مد نظر رکھ کر تیار کیا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ کہ استغاثہ کے کئی گواہ سرکاری اہلکار تھے۔ یہاں ہم یہ بات بھی دیکھتے ہیں کہ زبانی گواہی دینے والوں کی گواہی شک سے مبرا نہ تھی اور نہ ہی قابل بھروسہ تھی۔ ان نقاط پر ڈیئل مل ایڈوکیٹ نے بہت زور دیا تھا۔ لیمبورک نے جنرل آفیسر کمانڈنگ کو اطلاع دی تھی کہ وکیل ڈیئل مل ایک مرتبہ کورٹ کو قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا کہ گواہوں سے جراح کرتے وقت ڈی ایس پی غنی کو عدالت سے باہر نکل جانے کا حکم دیا جائے۔ اسے یہ احساس ہوا کہ اس وکیل نے یہ طرز اختیار کر کے قانونی بات کی ہے اور استغاثہ کو استدعا کرنے سے روک دیا ہے۔ جی او سی کو تحریر کردہ نوٹ کے ذریعہ لیمبورک انہیں سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وکیل ڈیئل مل کا رویہ بالکل فطری ہے کہ ڈی ایس پی کی موجودگی میں گواہ کی گواہی کو سچ نہیں سمجھتا ہے۔ آخر میں وہ کئی ایک باتوں کا ذکر کرتا ہے جو ملکی روایات سے متعلق ہیں۔ ڈی ایس پی غنی کی ٹرانسفر ہونے کے بعد ان کی جگہ محمد حسین ڈی ایس پی کے عہدے پر فائز ہوئے۔ حکومت سندھ کے ایک اہم گواہ اور برطانیہ کے ایک وزیر اس مقدمے میں گواہی دیتے ہوئے گھبرا رہا تھا جس کا نام صفائی کے گواہ کے طور پر آیا تھا۔ اسے مشورہ دیا گیا تھا کہ وہ وکیل صفائی کو بتادے کہ اس کے بیان سے پیر صاحب کو کوئی بھی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔ اس لئے صفائی کے گواہ کے طور پر اس کا نام خارج کیا جائے۔ ڈاؤ نے 22 فروری 1943ء کو لنلتھگو کو تحریر کیا کہ رچرڈسن پیر پر دائر مقدمے کی کاروائی سے بہت خوش ہے ڈاؤ کو یہ معلوم ہوگیا کہ پیر صاحب نے سندھ کے وزیر اعلیٰ اور دو دیگر وزراء کے

نام اپنی صفائی میں گواہوں کے طور پر دیے تھے ایسا نظر آرہا تا کہ صفائی کے گواہ برائے نام تھے۔ ڈاؤ سے قبل اس کی جگہ گراہم تعینات تھے جو ایک ہفتے تک اس کے ساتھ رہے۔ پیر صاحب نے اس کا نام بھی اپنی صفائی کے گواہ کے طور پر پیش کیا تھا۔ اس کی گواہی ایک گھنٹے تک جاری رہی۔ ڈاؤ نے لنلتھگو کو تحریر کیے ہوئے اپنے خط میں لکھا تھا کہ اس معاملے کے متعلق اسے کوئی فکر نہیں ہے کیونکہ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اس مقدمے کو نقصان پہنچانے والی کوئی کاروائی نہیں ہو رہی ہے سندھ کوارٹرلی کے 1982ء کے شمارے میں میجر جنرل وصال محمد بتاتے ہیں کہ میں نے عدالت میں یہ دیکھا کہ پیر صاحب کچھ لکھ کر صفائی کے وکیل کو بھیج رہے تھے اس نے کبھی بھی اس کے ساتھ بات نہیں کی۔ عدالتی کاروائی معمول کے مطابق جاری رہتی تھی۔ پیر صاحب اپنے اعتراضات کا اظہار وکیل کے ذریعہ کرتے تھے۔ پیر صاحب نے یہ بھی اعتراض کیا تھا کہ پورے ہندوستان میں ایک بھی ایسا فوجی عمل دار نہیں ہے جو اس کورٹ کا ممبر بن سکے لیکن کورٹ کے صدر نے اس کے اس اعتراض کو فوراً" ہی رد کردیا تھا۔ اس کا موقف یہ تھا کہ عدالت کے سب اراکین غیر جانبدار ہیں۔ اس لئے وہ اس مقدمے میں انصاف کر سکیں گے۔ وصال محمد کا خیال ہے کہ "پیر صاحب عدالت کی کاروائی سے بے انتہا بددل ہو چکے تھے۔ انہوں نے اپنے وکیل کی معرفت اپنے خیال کا اظہار کیا تھا کہ حکومت انہیں پھانسی دینے کے بارے میں عزم کر چکی ہے' اس کا نقطہ نظر تھا کہ انگریز جو بھی چاہتے ہیں کر گزریں گے اسے اس قسم کی نام نہاد عدالت کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ جب عدالت نے پیر صاحب سے استفسار کیا کہ جو الزامات استغاثہ نے تم پر عائد کئے ہیں ان کو قبول کرتے ہو یا نہیں؟ پیر صاحب نے جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ چونکہ وہ اس وقت قید میں ہیں اس لئے وہ اس حیثیت میں نہیں ہیں کہ سرکار کے خلاف سازش کر سکیں یا اس کے خلاف جنگی تیاریاں کر سکیں۔ یہ الزام جھوٹے اور بے بنیاد ہیں اس کے بعد عدالت کے صدر نے استغاثہ کو مقدمے کی کاروائی آگے بڑھانے کا حکم دی۔

الانسٹر میکنتھ اپنی تحریر کردہ یادداشت میں لکھتا ہے کہ کرنل ہومز نے بھی پیر صاحب کے خلاف گواہی دی تھی لیکن گواہی دیتے وقت وہ پیر صاحب کو دیکھ نہیں سکا تھا کیونکہ پیر

صاحب کے سامنے ایک پردہ ڈال دیا گیا تھا اس لئے کوئی بھی گواہ پیر صاحب کو دیکھ نہیں سکتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سید صبغت اللہ شاہ کی آنکھیں ایسی سحر انگیز تھیں جو پیر صاحب کو دیکھنے والوں کو مسحور کر دیتی تھیں۔ اس بات کا ذکر میجر جنرل وصال محمد نے بھی کیا ہے کہ جب وہ گواہ کو پیش کرتے تھے۔ وہ پیر صاحب کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد یا ان کی آواز کو سننے کے بعد گواہی سے پھر جاتے تھے۔ اس لئے ایسے اقدام کئے گئے تھے کہ کوئی بھی گواہ اپنی گواہی سے مکر نہ جائے اس کے علاوہ نفیسہ شاہ اور حسن مجتبیٰ کے مقالے "نیوز لائن" میں شائع ہوئے ہیں جن میں انہوں نے لکھا ہے کہ کوئی بھی گواہ پیر صاحب کے چہرے اور آنکھوں کو دیکھنے کی سکت نہیں رکھتا تھا اور ہر گواہ کو پردے کے پیچھے بٹھا کر اس سے گواہی لی جاتی تھی۔

میجر جنرل وصال محمد یہ بھی تذکرہ کرتا ہے کہ پیر صاحب عدالت کی ہر پیشی پر اپنے وکیل کو تحریری طور پر ہدایات دیتے تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ اپنی صفائی کے لئے کوششیں لاحاصل ہوں گی۔ عدالت نے فیصلہ دیا کہ وہ مجرم ہیں اس لئے انہیں پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔

سینٹرل جیل حیدرآباد کا بھنائی سیل نمبر ۱ جہاں پیر صاحب قید تھے

اس بہادر انسان نے موت کا نہایت شان اور وقار سے استقبال کیا

موت کی سزا سنانے سے قبل سندھ کے گورنر نے پیر صبغت اللہ شاہ کو جلاوطن کرنے کے امکانات پر بھی غور کیا تھا۔ اس نے جلاوطنی کا جواز پیش کرتے ہوئے یہ کہا تھا کہ سب لوگ اس بات سے بہت خوفزدہ ہیں کہ وہ سزا کاٹ کر اپنے اہل و عیال کے ساتھ واپس آئیں گے تو نہ جانے کیا ہو جائے گا؟ اس نے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ دس سال کے دوران ہونے والے واقعات کا بدلہ لینے کے لئے بہت سے لوگ قتل کر دیے گئے تھے۔ سندھ کے عوام نے پہلے ہی پیر صاحب کی واپسی کے لئے دعائیں مانگنا شروع کر دی تھیں۔ یہ واقعات اس لئے رونما ہوئے تھے کہ حکومت سید صبغت اللہ شاہ پر عائد مقدمات میں رعایت کرے۔ آخر کار انہیں سندھ واپس لایا گیا تھا۔

سندھ کے گورنر ڈاؤ نے 10 اپریل 1942ء کو لمبوک کے نام ایک خط تحریر کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ معاملہ یوں نظر آ رہا ہے کہ پیر کو کالے پانی کی سزا ضرور ملے گی۔ محکمہ داخلہ کے اعلیٰ افسران اس امکان پر غور کر رہے ہیں کہ پیر کو کس جگہ رکھا جائے۔ "سیچلیس" یا "کینیا" دو ایسے مقام ہیں جن میں پیر صاحب کو رکھنے کا سوچا گیا تھا۔ کئی ایک کا خیال تھا کہ انہیں "حبش" میں رکھا جائے۔ گورنر کا خیال بھی یہی تھا' لیکن اس ان کا نقطہ نظر تھا کہ پیر
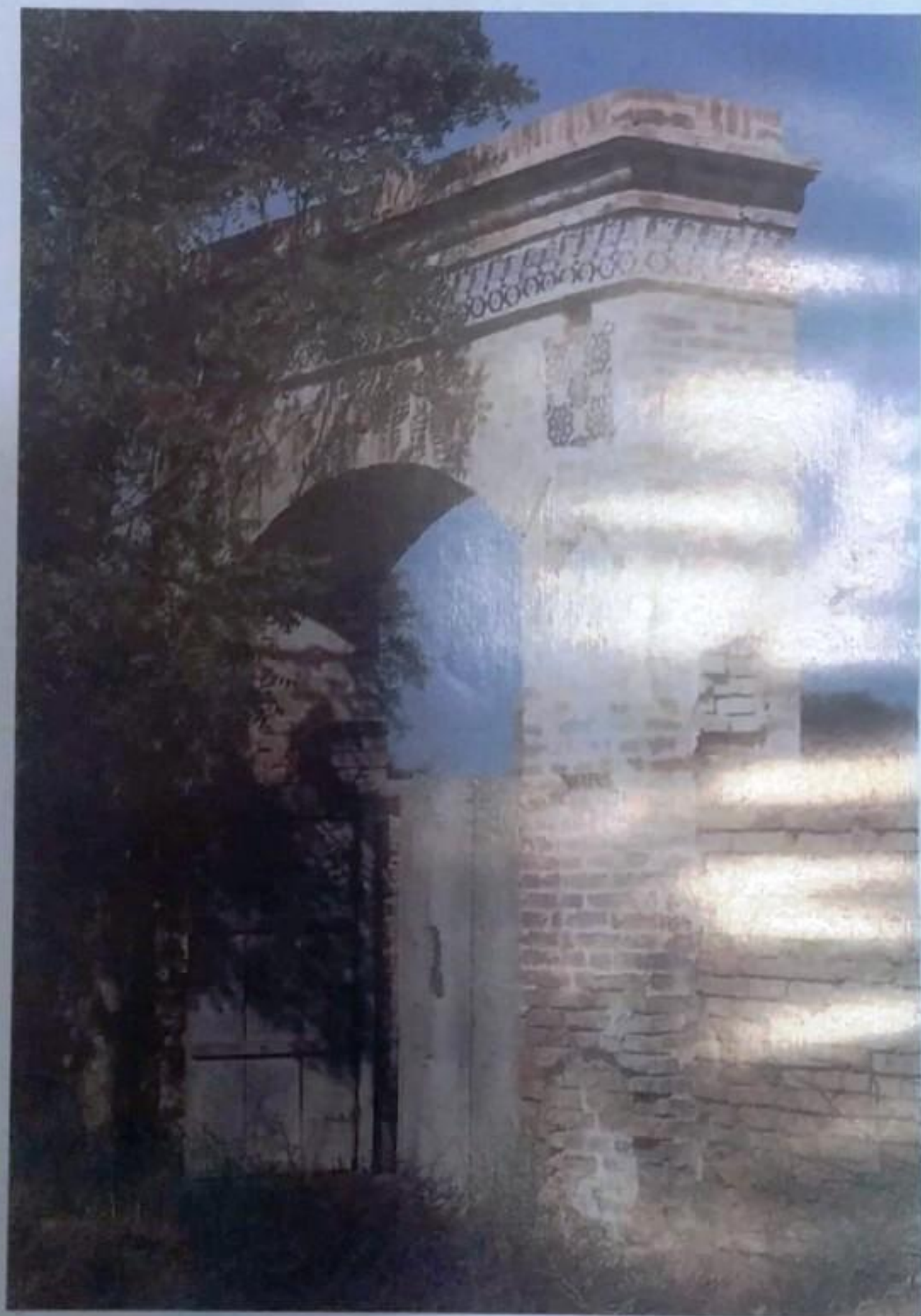
گڑنگ بنگلہ (سانگھڑ) جسے انگریزوں نے بموں سے تباہ کیا

بشکریہ اللہ ورایو بھن جھول
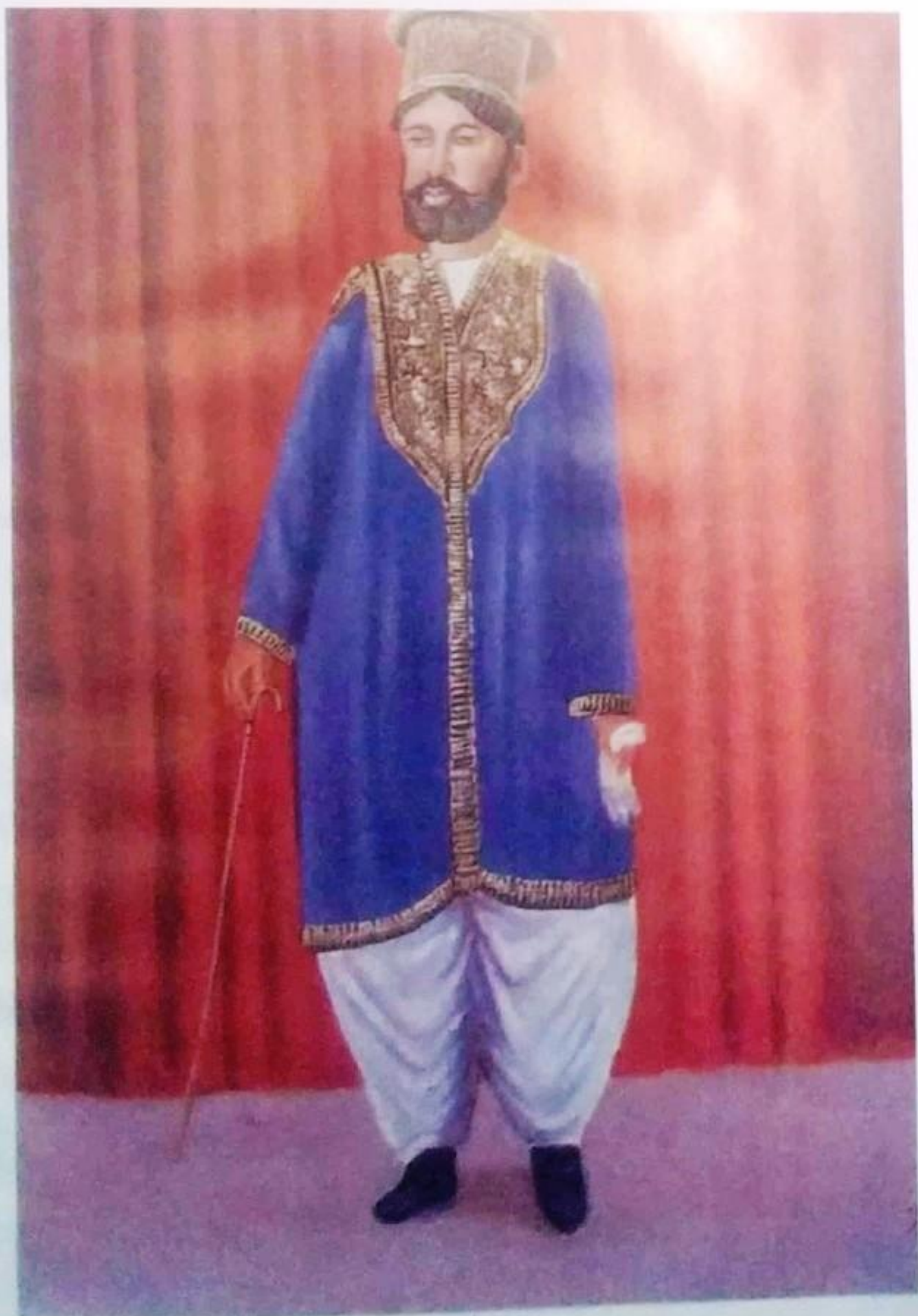
سید پیر سکندر علی شاہ راشدی
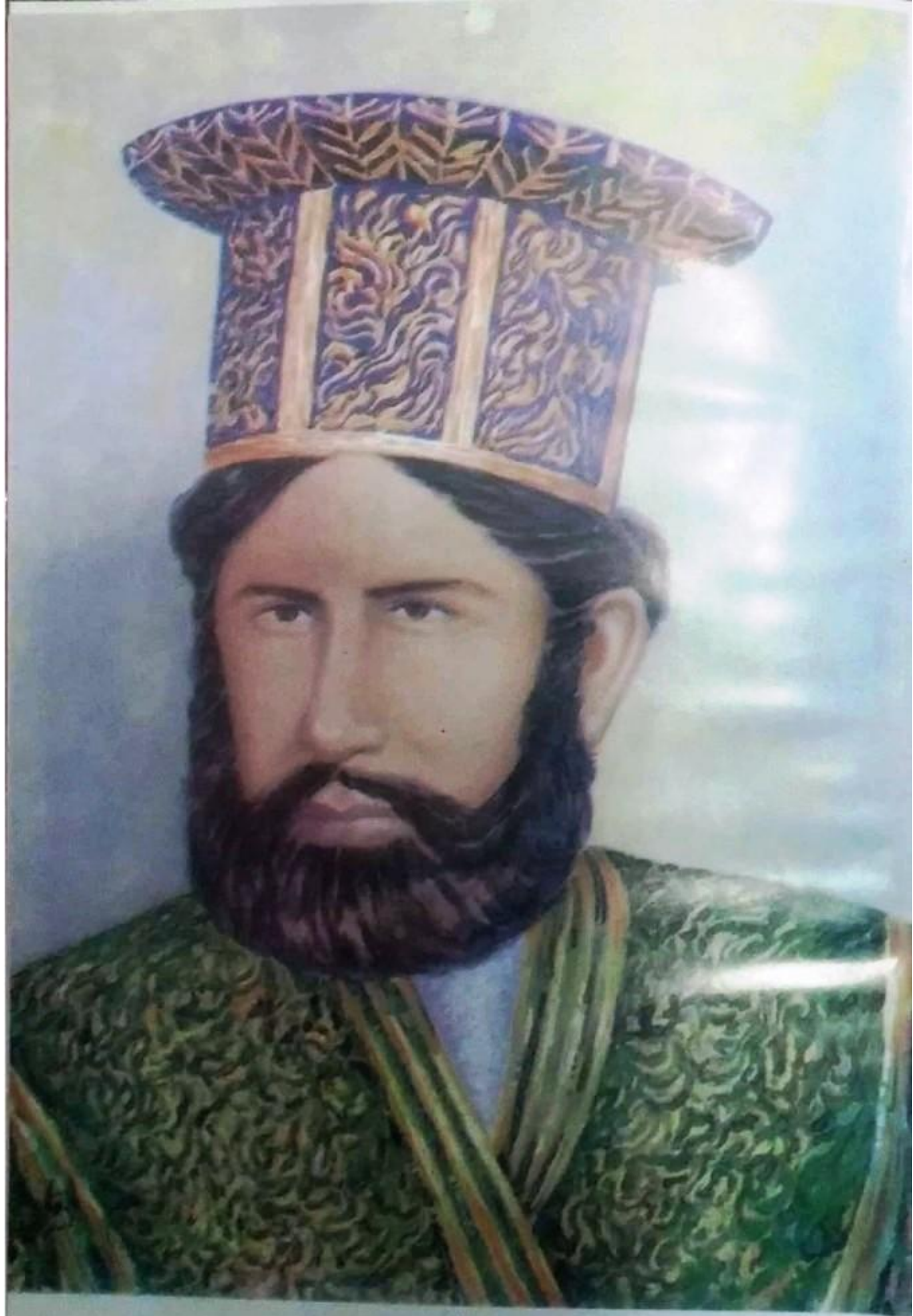
سید پیر حزب اللہ شاہ راشدی

موجودہ پیر صاحب پگاڑا بشکریہ ڈاکٹر سہیل داھوہ

کے لئے تجویز کردہ سزا سے لیمبوک کا متفق ہونا ضروری ہے۔ گورنر مزید بتاتا ہے کہ ہر ایک شخص اس بات کی حمایت کرتا ہوا دکھائی دے رہا ہے کہ حر تحریک کو ختم کرنے کے لئے پیر صاحب کے پورے خاندان کو جلاوطن کر کے ہندوستان سے باہر بھیج دیا جائے تاکہ وہ پھر یہاں واپس نہ آسکیں۔

30 جنوری 1943ء میں جے ایم سلیڈن J.M.SLADEN نے ایچ ٹی لیمبوک کو ایک ضروری خط ارسال کیا اور اس خط کے ساتھ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے سولہویں ضابطے کے تحت جاری کردہ حکمنامے کی ایک نقل بھی بھیجی جس کا تعلق پیر صاحب کے اہل وعیال سے تھا۔ خط میں اس نے لیمبوک سے مشورہ طلب کیا تھا کہ پیر صاحب کے دو فرزندوں کو باقی گھر کے افراد سے الگ رکھنا مناسب ہوگا یا نہیں؟ اس پر لیمبوک نے جواب بھیجا تھا کہ اس طرح مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ اگر ہوشیاری سے کام لیا جائے اور اس مشکل وقت میں کسی کو ان سے ملنے نہ دیا جائے۔ 1942ء اور 1943ء کی خفیہ دستاویزات کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ سندھ کی انگریز انتظامیہ نے پیر صاحب کو گرفتار کرنے اور ان سے جان خلاصی کرنے کے لئے پختہ عزم کرلیا تھا۔ ان کا نقطہ نظر یہ بھی تھا کہ ان کو پھانسی دی جائے اور کسی خفیہ مقام پر دفن کردیا جائے' لیکن کئی اعلیٰ افسران کو مستقبل میں پیش آنے والے ممکنہ عجیب وغریب واقعات کی وجہ سے تشویش تھی کہ کہیں وہ نظربندی کے دوران خودکشی نہ کر بیٹھیں' لیکن ایسی باتوں کا کوئی جواز نہ تھا جس سے اندازہ لگایا جاسکے کہ وہ نظربندی کے دوران یہ قدم اٹھائیں گے۔ ایک بات ضروری تھی کہ سید صبغت اللہ شاہ پر جاری مقدمے کی وجہ سے انتظامیہ شدید ذہنی دباؤ میں تھی اور متعلقہ سرکاری اہلکار بھی امکانی خطرات کا سامنا کرنے کے لئے تیار تھے۔

پیر صاحب پر مقدمہ دائر کرنے سے پہلے اور اس مقدمے کی سماعت کے دوران سندھ کی انگریز انتظامیہ اس نقطہ نظر کی حامل تھی کہ جب پیر صاحب کو پھانسی کی سزا سنائی جائے گی تو وہ خوف کے مارے دہل جائیں گے اس طرح حر بھی دہل جائیں گے لیکن سید صبغت اللہ شاہ راشدی ایک بے باک اور بہادر انسان تھے۔ مقدمے کی کاروائی کے دوران ان پر موت کا کوئی خوف نہیں تھا اور اس سارے عرصے میں ان کے حوصلے بہت بلند رہے۔ کوئی

بھی تشویش اور ڈر ان کے دل میں جاگزیں نہیں ہوا۔ اسلئے سندھ کی سامراجی حکومت بہت مایوس ہوگئی تھی۔ اس لئے حکومت نے سوچا کی حروں کے بلند حوصلوں کو پست کرنے کے لئے یہ افواہ پھیلائی جائے کہ پیر صاحب نے پھانسی کے خوف کی وجہ سے خودکشی کرنے کی کوشش کی ہے۔ 23 فروری 1943ء میں اسپیشل برانچ کی جاری کردہ ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا خیال تھا کہ یہ افواہیں پھیلائی جائیں کہ پیر صاحب اپنی پھانسی کی سزا سننے کے بعد ضرور خودکشی کریں گے۔ اس لئے پیر صاحب کو اس اقدام سے روکنے کے لئے 27 جنوری 1943ء کو چھ بجے کے بعد قابل اعتماد پہرے دار رکھے گئے ہیں حکمنانے میں یہ بھی تحریر تھا کہ ان پر تین افراد خصوصی نگرانی کریں گے اور پہرےَ کے لئے مندرجہ ذیل سنتری مقرر کئے گئے ہیں۔ مسٹر لانگ مین شام چھ بجے سے رات نو بجے تک، سارجنٹ ارون رات کے نو بجے سے رات بارہ بجے تک جبکہ کارپورل ہیگ رات کے بارہ بجے سے تین بجے تک اس کے بعد پھر لانگ مین اپنے فرائض انجام دیں گے۔ جو کہ تین بجے سے لے کر صبح چھ بجے تک کا پہرہ ہوگا۔

اس حکمنامے میں یہ بھی واضح طور پر لکھا گیا تھا کہ ان خاص پہریداروں کا کام یہ ہوگا کہ وہ قیدی پر خاص نظر رکھیں کہ کہیں وہ رات کے کسی پہر خودکشی نہ کر بیٹھے۔ اس کھولی کی چابی پہرے پر موجود سنتری کے پاس ہوگی۔ جب وہ دیکھے کہ قیدی خودکشی کے لئے کوشش کررہا ہے تو وہ چابی سے قفل کھول کر اپنے دیگر دو ساتھیوں کی مدد سے قیدی کو اس اقدام سے باز رکھے۔ اس کے باقی دو پہریدار ساتھی اسی جگہ قریب ہی سو رہے ہونگے۔ اس حکمنامے میں یہ بھی مزید تحریر کیا گیا ہے کہ دن کو بھی ہر پہریدار اپنے معمول کے فرائض کے مطابق پہرہ دیتے رہیں گے اور ہر وقت ان کی نظریں قیدی کے تعاقب میں ہونگی۔ ضروری حاجت کے لئے اسے اجازت دی جائے لیکن اسے وقت وہ دیا جائے جو وہ ہمیشہ لیتا رہا ہے۔ اگر ضروری حاجت میں زیادہ وقت لگ جاتا ہے تو پہرے پر معمور سنتری اپنے آپکو مطمئن کرنے کے لئے آگے بڑھ کر دیکھ لے کہ صورتحال حسب معمول ہے اگر قیدی کچھ دیر کرے تو سنتری اسے حاجت روائی جلد ختم کرنے کے لئے کہے اگر اسے کوئی جواب نہ ملے تو وہ اپنے اطمینان کی خاطر بیت الخلاء کے اندر جھانک کر دیکھے۔

قیدی کے لئے خوردونوش تیار کرنے کا انتظام قید تنہائی کے آنگن میں کیا جائے اور قیدی باورچی کو اس صحن سے کبھی بھی باہر جانے کی اجازت نہیں دینی چاہئے کسی بھی شخص کو حیدرآباد سینٹرل جیل کے سپرنٹنڈنٹ کی اجازت کے بغیر قیدی سے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔ ایسی اجازت ہر ملاقات کے وقت علیحدہ لی جائے گی۔

اس حکمنامے کے اختتامی پیراگراف میں اس بات پر زیادہ زور دیا گیا ہے کہ چونکہ قیدی نہایت بے چین ہے اس لئے پہرے پر معمور اشخاص کو چاہئے کہ وہ قیدی کی سخت نگرانی کریں تاکہ وہ خودکشی کی کوشش نہ کرپائے اور خاص طور پر رات میں اس کی زیادہ نگرانی کی جائے اس حکمنامے کی نقول آئی جی جیل خانہ کراچی' مسٹر فریڈرک بنگ' پولیس کمشنر' چیف ایڈمنسٹریٹر مارشل لاء سندھ' مارشل لاء کے سول ایڈوائزر مسٹر لیمبوک اور اپر سندھ فورس کے بریگیڈیر میجر کو ارسال کی گئی تھیں۔

پیٹرمین تحریر کرتا ہے کہ کورٹ مارشل نے اس کیس کی کاروائی ایسی جگہ بند کمرے میں کی تھی جس کے دروازوں پر تالے لگائے گئے تھے اور یہ کاروائی مسلسل تین روز تک جاری رہی۔ مذکورہ مقدمے کی کاروائی کا ایک حرف بھی اس کمرے کی چاردیواری سے باہر نہیں نکلا۔ پیر صاحب کو اس جرم کی پاداش میں پھانسی کی سزا دی گئی تھی کہ انہوں نے تاج برطانیہ کے خلاف بغاوت کی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل مولسورتھ نے اقرار کیا ہے کہ اگر پیر صاحب کو موت کے علاوہ اور کوئی سزا دی جاتی تو وہ بحیثیت چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اس سزا کو موت کی سزا میں تبدیل کرنے کے اختیارات کے حامل تھے۔ یہ خصوصی اجازت اعلیٰ عدالتی اختیارات اور طریق کار کے نقطہ نظر سے دی گئی تھی اور وہ کاغذات ایڈوکیٹ جنرل کے سپرد کردیے گئے تھے۔ جس کے مشورے کے مطابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر نے یہ اپیل رد کردی تھی پیر صاحب کو یہ بھی اجازت دی گئی تھی کہ وہ وائسرائے کو رحم کی درخواست پیش کرسکتے ہیں لیکن یہ درخواست بھی رد کردی گئی تھی۔ مولسورتھ کا کہنا ہے کہ 17 مارچ 1943ء کو ایک حکم حیدرآباد بھیجا گیا تھا کہ کورٹ مارشل کے فیصلے پر عمل کیا جائے۔

مارشل لاء کے چیف ایڈمنسٹریٹر کے پولیس ایڈوائزر مسٹر فریڈرک بنگ 18 مارچ کو پیر

صاحب سے جا کر ملا تھا اور انہیں بتایا تھا کہ وائسرائے کو بھیجی گئی ان کی اپیل رد ہو چکی ہے۔ اورینٹل اور انڈیا آفس لائبریری کے کاغذات میں سندھ کے گورنر کی خط و کتابت سے متعلقہ دستاویز ملے ہیں جن میں وائسرائے کو تحریر کردہ ایک مختصر خط بھی موجود ہے۔ جس میں گورنر لکھتا ہے کہ پیر صاحب پھانسی کی سزا سے پریشان نہیں تھے اور ان کا رویہ نہایت باوقار تھا۔ سندھ کے گورنر نے وائسرائے کو یہ بھی اطلاع دی تھی کہ جب پیر صاحب کو پھانسی کے لئے مقرر کردہ تاریخ سے متعلق آگاہ کیا گیا تو ان کے چہرے پر اطمینان تھا۔ وہ بہت پر سکون تھے۔ پیر سید صبغت اللہ شاہ نے کمشنر کو بتایا تھا کہ میں اپنی موت کا نہایت شان اور وقار کے ساتھ سامنا کروں گا۔ پیر صاحب نے اس سے یہ بھی استفسار کیا کہ پھانسی دینے کے بعد اس کی لاش کو کہاں دفن کیا جائے گا کیونکہ میری خواہش ہے کہ میری لاش کو پیر جو گوٹھ میں اس جگہ دفن کیا جائے جہاں میرے آباء واجداد مدفن ہیں ان کی دلی تمنا تھی کہ انہیں دفن کے لئے ایک چھوٹے سے مقبرہ کی جگہ دی جائے جہاں بہت خالی جگہ موجود ہے۔

میجر جنرل وصال محمد کا بیان ہے کہ دوران قید مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ ایک شیر کٹہرے میں بند ہے۔ اس کا ایک بیان یہ بھی ہے کہ پھانسی سے قبل پیر صاحب نے کہا تھا کہ انہیں اس بات کا افسوس ہو وہ سگریٹ نوشی زیادہ کرتے تھے۔ بہرحال 20 مارچ 1943ء کو پیر صاحب کو پھانسی دیکر شہید کردیا گیا۔ ڈاؤ نے لنلتھگو کو لکھا تھا کہ جب پھانسی کا پھندہ پیر صاحب کے گلے میں ڈالا گیا تو اس وقت وہ بہت باوقار اور بلند حوصلہ دکھائی دے رہے تھے ان کے چہرے پر اطمینان وسکون نظر آرہا تھا۔

پیر صاحب کی پھانسی کو مختلف ذرائع سے بہت زیادہ مشتہر کیا گیا تھا۔ ان کے مریدوں کو ان کا آخری دیدار دیکھنے کی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔

وصال محمد کا بیان ہے کہ حر سمجھ رہے تھے کہ پیر صاحب کو نشہ آور چیز کھلا کر بے ہوش کردیا گیا ہے اور یہ جھوٹ ہے کہ ان کو پھانسی دیکر شہید کیا گیا ہے مریدوں کا کہنا تھا کہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے اور انگریز ہمیں بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ مریدوں کا یہ بھی خیال تھا کہ

پیر صاحب کو سندھ کے باہر کسی جیل میں بند کر دیا گیا ہے اس لئے بتایا جارہا ہے کہ وہ وفات پاچکے ہیں حر سمجھ رہے تھے کہ اس قسم کی چالیں انہیں دل برداشتہ کرنے اور دھوکہ دینے کے لئے کی جارہی ہیں چونکہ انگریز حکومت اس وقت یورپ اور برما میں جنگ کے دباؤ میں آچکی ہے اس لئے وہ اپنی فوج زیادہ وقت کے لئے سندھ میں رکھنا نہیں چاہتی ہے۔
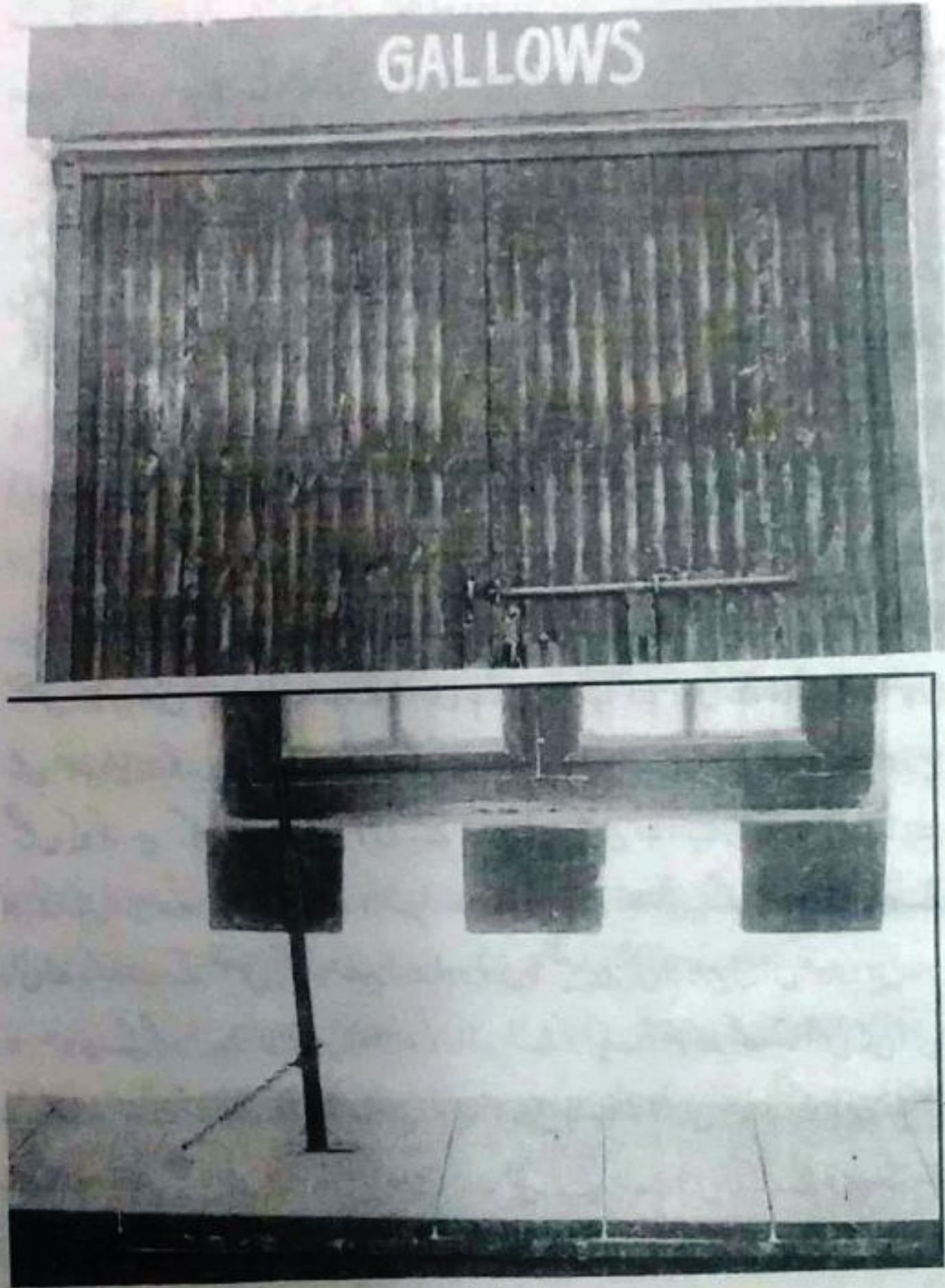
سینٹرل جیل حیدر آباد کے پھانسی گھاٹ کا اندرونی و بیرونی منظر

بشکریہ معظم جاہ انصاری

پیر صاحب کی خفیہ تدفین

میجر جنرل وصال محمد نے سندھ کوارٹرلی میں 23 جنوری 1980ء کو شائع ہونے والے اپنے ایک خط میں اس حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ اس نے سید صبغت اللہ شاہ کو مقدمے اور اس کی خفیہ معلومات سیکورٹی کی پابندیوں کی وجہ سے کسی کو بھی نہیں دی تھیں۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ پیر صاحب کی قبر خلیج فارس سے دور ایک جزیرہ میں ہے۔ ان کی تدفین اور قبر کے متعلق فقط وہ فوجی اہلکار واقف ہونگے جنھوں نے پیر صاحب اور حروں کے خلاف کاروائیوں میں حصہ لیا ہوگا۔ وصال محمد بتاتا ہے کہ سیکورٹی کی سخت پابندیاں حفظ ماتقدم کے طور پر تھیں کیونکہ یہ سمجھا جارہا تھا کہ زندہ سے مرے ہوئے پیر صاحب زیادہ خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ سندھ کے گورنر اور وائسرائے کے درمیان 1940ء کے عشرے میں ہونے والی خط وکتابت کے متعلق کچھ دستاویزات اور فوجی فائلیں برٹش لائبریری میں موجود ہیں۔

سندھ کے گورنر نے 21 نومبر 1942ء کو وائسرائے کو ایک مختصر خط لکھا تھا جس میں اس نے وضاحت سے کہا تھا کہ اگر پیر صاحب کو پھانسی دی جائے تو انہیں سندھ کے باہر دفن کیا جائے اور قبر کو ممکن حد تک طویل عرصے تک خفیہ رکھا جائے اس کے لئے ایسی جگہ کا انتخاب کیا جائے جہاں پیر کے مرید قیام نہ کرتے ہوں۔

وائسرائے نے 21 دسمبر 1942ء کو سندھ کے گورنر کو ایک ٹیلی گرام بھیجا تھا جس میں بتایا

گیا تھا کہ وہ پیر کو دفن کرنے کے لئے دوسرے علاقوں کے علاوہ مدھیہ پردیش کے بارے میں بھی سوچ رہا ہے اس سلسلے میں وہ تیونام سے خط و کتابت کر رہا ہے جو اس قسم کے انتظامات خفیہ طور پر کر سکتا ہے۔ انہیں یہ احساس ضرور تھا کہ پھانسی کی سزا دینے کی صورت میں اس نوع کے انتظام کئے جائیں جو ہر شخص پیر صاحب کو پھانسی کی سزا دینے کے واقعہ پر یقین کرلے۔ اس لئے ٹیلی گرام میں اس امر پر زور دیا تھا کہ آیا پیر صاحب کو حیدر آباد جیل کے اندر پھانسی دی جائے' یا سندھ کی حدود سے باہر۔ اس ٹیلی گرام کی نقول سر رچرڈ ٹاٹنہم اور جنرل مولسورتھ کو بھی ارسال کی گئی تھیں۔

پیر صاحب کو چونکہ پھانسی کی سزا دینے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا اس لئے سندھ کے گورنر اور وائسرائے ہند کے لئے ان کے تجہیز و تکفین کا معاملہ نہایت اہم تھا سندھ کے گورنر نے بھی 2 جنوری 1943ء کو ایک ٹیلی گرام روانہ کیا تھا جس میں انہوں نے پیر صاحب کی امکانی قبر کے لئے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا وائسرائے نے اس ٹیلی گرام کا جواب 11 جنوری کو روانہ کیا تھا جس میں وائسرائے نے بتایا تھا کہ پیر صاحب کی میت کو ہندوستان سے باہر عدن میں دفنانے کے امور پر غور کیا جا رہا ہے لیکن یہ فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوسکا تھا۔ 27 جنوری 1943ء کو وائسرائے نے سندھ کے گورنر کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ اس قسم کی ہدایات دی تھیں کہ دفن کے متعلق جن مقامات کے متعلق غور و خوض کیا گیا ہے ان پر بغیر وقت ضائع کئے اتفاق رائے ہو جانا چاہئے اور سندھ کے گورنر کو اپنی رائے کا اظہار کرنے کے لئے تاکید کی گئی تھی۔

اعلیٰ حکام نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ پیر صاحب کو ساحل سمندر پر دفن کیا جائے۔ ڈاؤ نے 29 جنوری 1943ء کو لنلتھگو کو تحریر کیا کہ پیر صاحب کو ساحل سمندر پر دفنانے کی بات پر اتفاق رائے نہیں ہوسکا ہے۔ وہ مزید تحریر کرتا ہے کہ جنرل رچرڈسن کا خیال ہے کہ میت کو بذریعہ جہاز انگریز حکومت کے زیر تسلط علاقے "عدن" بھیجا جائے اور ان کو "عدن" کے نزدیک دفنایا جائے ڈاؤ اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ پیر کو اگر وہاں دفن کیا گیا تو مجھے کسی بھی قسم کا اعتراض نہیں ہوگا لیکن ان کے وزراء کا خیال ہے کہ اس قسم کی باتیں غیر ضروری ہیں اور وہ بھی ان سے متفق ہیں۔

وائسرائے نے گورنر کو 9 فروری 1943ء میں اپنے جواب میں بتایا کہ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ سندھ کے وزیر پیر صاحب کی تدفین کے متعلق بھی سوچ رہے ہیں اس سے پہلے بھی ایک پیر پگارا کو شہید سمجھا گیا تھا اس لئے ان کا مقبرہ بھی تشدد کی کارروائیوں کا مرکز بن گیا تھا۔

سندھ کے گورنر اور وائسرائے اس معاملے کے متعلق بحث کرتے رہے کہ پیر صاحب کو ہندوستان سے باہر یا "جیوانی" میں دفن کیا جائے۔ وائسرائے کے ذہن میں ایک قابل عمل حکمت عملی جا گزیں تھی کہ فوج پیر صاحب کو "جیوانی" یا بلوچستان کے سمندری کنارے یا استولا جزیرہ پر دفن کرنے کا بندوبست کرے۔ لارڈ لنلتھگو نے سندھ کے گورنر ڈاؤ سے مشورہ کیا تھا اور انہوں نے بھی ان سے اتفاق رائے کا اظہار کیا تھا لیکن اس بات پر مزید غور و فکر کرنے کی ضرورت تھی کیونکہ تجویز کردہ دفن کا مقام قلات کی حدود میں تھا جہاں سخت انتظامات کی ضرورت تھی۔

سندھ کے گورنر نے 10 فروری 1943ء کو ایک ٹیلی گرام کے ذریعہ وائسرائے ہند کو بتایا تھا کہ اگر جیوانی یا ہندوستان سے باہر کسی بھی جگہ دفن کا انتظام آسانی سے ممکن ہے تو پھر مناسب رہے گا کیونکہ یہ منصوبہ پیر صاحب کو سندھ میں دفن کیا جائے مشکل ہے۔ اس طرح کی کوشش خطرے سے خالی نہیں ہوگی اگرچہ ان خطرات سے بھی نمٹا جا سکتا ہے۔ وائسرائے نے 23 فروری کو اس ٹیلی گرام کا جواب دیا جس میں اس نے واضح کیا تھا کہ پیر صاحب کی میت کو دفن کرنے کے لئے فوجی حکام سندھ سے باہر بندوبست کریں گے لیکن انہیں کراچی میں دفن نہیں کیا جائے گا اور ان کی تجہیز و تکفین اسلامی طریقہ سے ہوگی۔

کچھ عشروں تک پیر صاحب کی قبر ایک راز تھی اور اس کے متعلق مختلف قسم کے اندازے قائم کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر ایچ ٹی سورلے اپنی تصنیف

"THE DIVERSIONS OF MENEMOYNE"

کی جلد سوئم میں تحریر کرتا ہے کہ یہ بات درست ہو کیونکہ برطانوی انتظامیہ نے پہلے ہی سے اس طرح کا بندوبست کر دیا تھا۔ پیر صاحب کو پھانسی دینے کے واقعہ سے گیارہ مہینے قبل کراچی قلعے کے کمانڈر نے 17 اپریل 1942ء میں اعلان کیا تھا کہ "چرنا جزیرہ" ہوائی فوج کی

بمباری کے دائرے میں ہے۔ "بمبئی کرانیکل" نے اپنی 18 اپریل 1942ء کی اشاعت میں بھی ایک سرکاری خبر شائع کی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ انتظامیہ نے اعلان کیا ہے کہ جو بھی جہاز اس جزیرے کے ایک میل کے فاصلے کے اندر گزرے گا اور اسے نقصان پہنچ سکتا ہے اور حکومت اس کی ذمہ دار نہیں ہوگی۔ اس زمانے میں ایک افواہ یہ بھی گردش کررہی تھی کہ حیدر آباد سینٹرل جیل کی حدود کے اندر ایک خفیہ قبر کھدوائی جارہی ہے۔ جس میں چونا بھی بھر دیا گیا ہے۔ یہ بھی کہا جارہا تھا کہ پیر صاحب کی میت کو چونے کے دو بڑی تہوں کے اندر رکھ کر دفن کیا گیا تھا۔ اس کے بعد قبر پر مٹی ڈال کر اسے ہموار کیا گیا تھا اور قبر کے ہر نشان کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا تھا۔ ایسی افواہوں کے ذریعہ اشارہ مل رہا تھا کہ ان کی قبر کی نگرانی جنرل رچرڈسن، لمبیرک اور رڈلی خود کررہے تھے۔

اس سلسلے میں مولسورتھ کا بیان زیادہ قابل اعتماد ہے۔ وہ کہتا ہے کہ پیر صاحب کی میت رات کے سناٹے میں خفیہ طریقے سے دریائے سندھ کے انتہائی علاقے کی طرف روانہ کردی گئی تھی۔ جہاں سے میت کو "رائل انڈین نیوی" کے ایک جنگی جہاز میں سوار کیا گیا تھا۔ وہاں سے میت کو مکران کے ساحل سے دور استولا نامی جزیرے میں ایک گہری قبر کھود کر اسلامی طریقے سے دفن کیا گیا تھا۔ بعد میں ہر نشان مٹا دیا گیا تھا تاکہ یہ نہ محسوس ہو کہ یہاں کوئی قبر ہے۔ مولسورتھ نے یہ بات بھی اپنی یادداشت میں لکھی ہے کہ اس وقت کے نیول کمانڈر نے بھی یہ حقیقت تحریر کی ہے کہ اس جزیرے پر پانی کا نام ونشان نہ تھا لیکن سانپ وغیرہ زیادہ تھے۔

ان باتوں کی تصدیق پیر صاحب کی فائل سے بھی ہوتی ہے جس میں پیر صاحب کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ سیاسی قیدیوں کو سمندر پار قید میں رکھا جائے وغیرہ وغیرہ اور یہ فائل برٹش لائبریری میں موجود ہے۔ اس فائل میں ایک رپورٹ موجود ہے جس پر 23 اگست 1943ء کی تاریخ درج ہے اور اس کا عنوان ہے "مارشل لاء ان سندھ" اس فائل پر ایک نوٹ مسٹر گلکرائٹس نے اپنے قلم سے تحریر کیا تھا اس کے صفحہ نمبر 47 پر ایک نہایت خفیہ ٹیلی گرام بھی درج ہے جس کا نمبر 10098 اور تاریخ 19 مارچ 47 ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ ٹیلی گرام وائسرائے ہند نے سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو ارسال کیا تھا

جس میں تاکید کی گئی ہے کہ وائسرائے کی طرف سے ارسال کردہ اس ٹیلی گرام کو کسی بھی صورت میں پارلیمنٹ تک نہ پہنچانے دیا جائے۔ اس کے بعد وہ اسے بتاتا ہے کہ پیر صاحب کی رحم کے لئے دائر کردہ درخواست آرمی چیف اور اس نے رد کردی ہے اور یہ باتیں پھانسی کے لئے مقررہ کردہ تاریخ سے پہلے کی گئی ہیں۔ وائسرائے 'سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو یہ بات بھی سمجھاتا ہے کہ پیر صاحب کو پھانسی دینے سے "حروں کے غبارہ کی ہوا نکل جائے گی"۔ وہ مزید بتاتا ہے کہ پیر کو مکران کے ساحل سمندر سے دور استولا نامی ایک جزیرے میں دفن کیا جائے جو ریاست قلات کی حدود میں واقع ہے۔ وائسرائے اس بات کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ اس کی خبر فقط ہمیں ہوگی اور ضرورت ہوئی تو ہم اس قبر کی تلاش میں کامیاب ہوسکیں گے۔

کچھ سالوں کے بعد جب حروں کو حفاظتی حصار سے آزاد کرنے کے لئے ایک ٹریبونل تشکیل دیا گیا تو "قربانی" نامی ایک اخبار میں "حروں کے لئے ٹریبونل" کے عنوان سے ایک مقالہ چھپا تھا جس میں اس قسم کی تحریر تھی کہ حروں کے روحانی پیشوا مرحوم پیر پگاڑا کو جب پھانسی دینے کا فیصلہ کیا گیا تو گاندھی برٹش کیبنٹ مشن اور انگریز سیاستدانوں کی دعوتیں قبول کررہا تھا۔ مصنف مزید تحریر کرتا ہے کہ انگریز کی اس دوغلی حکمت عملی کو ہندوستان کی تاریخ میں اچھے الفاظ سے یاد نہیں کیا جائے گا اور انگریزوں کی ایسی غیرذمہ دارانہ باتوں کی وجہ سے اس کی نسل ہمیشہ کے لئے شرمسار رہے گی۔

سندھ کوارٹرلی کے 1989ء کے شمارے میں مسٹر اسلم حسین کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا جس میں وہ لکھتا ہے کہ اس کے مرحوم والد کسی زمانے میں یوپی حکومت کی طرف سے لکھنؤ میں "لیگل ریممبرنس" اور جوڈیشنل سیکریٹری تھے اس دور میں وہاں کے چیف سیکریٹری آر ایف موڈی تھے جو اس سے قبل سندھ کے گورنر کے فرائض انجام دے چکے تھے اور اسی نے ہی میرے والد سے پیر صاحب کی پھانسی کے متعلق گفتگو کی تھی۔ میرے والد کے نقطہ نگاہ کو سننے کے بعد مسٹر موڈی نے ان کی رائے ہندوستان کی حکومت کے ہوم ڈپارٹمنٹ کو ارسال کردی اس نے ایک خط میں اپنی رائے اس طرح لکھی تھی کہ پیر صاحب نے ایسا سنگین جرم کیا ہے جس کی وجہ سے ان کو پھانسی دی گئی ہے حالانکہ یہی جرم گاندھی سے بھی

سرزد ہوا لیکن اسے آغا خان کے محل کی طرف روانہ کردیا گیا ہے۔

پیر صاحب کو سزا دینے کے لئے ایک ملٹری کورٹ تشکیل دی گئی تھی اور ان کے مقدمہ کی کاروائی اسی عدالت میں شروع ہوئی۔ ایک سازش کے تحت مقدمے کی کاروائی اس طریقے سے چلائی گئی کہ اس روحانی اور سیاسی رہنما کو موت کی سزا مل سکے۔ اس حکم تعملی میں جوڈیشری کے تمام اختیارات انتظامیہ کے حوالے کردیے گئے تھے جس سے برطانیہ کے نو آبادیاتی انصاف کی قلعی کھول جاتی ہے۔ انگریزوں نے پیر صاحب کے خلاف گواہوں پر دباؤ جاری رکھا اور کئی قسم کی رشوتیں بھی ان کو دی گئی۔ پھر بھی گواہی اس لائق نہ تھی جس کے بل پر پیر صاحب کو پھانسی کی سزا دی جاسکتی لیکن اس بہت بڑے قانونی سقم کے باوجود انہیں پھانسی دی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ انگریز حکمرانوں کو حکومت کرنے کے لئے کچھ مدت اور مل گئی تھی لیکن اس حرکت کی وجہ سے قانون کی حکمرانی اور انصاف کے اصولوں کو کاری ضرب لگی تھی۔ عدالت کے اس فیصلہ کی وجہ سے جرائم کے متعلق انصاف کا نظام اپنی وقعت اور وقار کھو بیٹھا اور سیاسی حلقوں نے اسے بطور ایک ہتھیار کے استعمال کیا۔

___O___
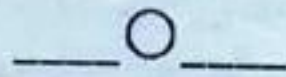
سورھیہ بادشاہ کی شہادت

اور

نڈر اور بہادر حر

وائسرائے کے اسٹاف آفیسر مسٹر گلکرانسٹ نے 23 مارچ 1943ء کو ایک رپورٹ تیار کی جس کے مطابق (81) اکیاسی حر فوج اور پولیس سے مقابلہ کرتے ہوئے مارے گئے تھے جبکہ اناسی (79) حروں پر ٹریبونل میں مقدمات چلا کر انہیں موت کی سزا دیدی گئی تھی اور 924 کو مارشل لاء ٹریبونل نے مختلف سزائیں سنائیں جبکہ 107 افراد کو بغیر مقدمہ چلائے آزاد کردیا گیا تھا۔ اس رپورٹ میں اس حقیقت کو واضح نہیں کیا گیا ہے کہ حروں کی چھاپہ مار کاروائیوں میں کتنی شدت تھی۔ رپورٹ میں فقط مختلف اقسام کی سزاؤں کا ذکر ملتا ہے جو نوآبادیاتی نظام کے تحت اختیارات رکھنے والوں نے حروں کو دی تھیں۔ کئی حر ایسے شدید زخمی ہو گئے تھے کہ ان کو کوئی سزا بھی نہیں دی جا سکتی تھی اور جو کچھ عرصے کے بعد وفات کر گئے تھے۔

مولسورتھ کا بیان ہے کہ پیر صاحب کو پھانسی دینے کے بعد ان کی لی گئی تصاویر کو شمالی

سندھ کے کئی شہروں میں اہم مقامات پر لگایا گیا تھا۔ میجر جنرل وصال محمد ایسی باتوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس نے سندھ کوارٹرلی میں شائع شدہ اپنے مقالے میں بیان کی ہیں۔ میں کے ساتھ کئی مصنفین نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ بہت سے حروں کو پیر صاحب کو پھانسی دینے کی خبر پر اعتبار ہی نہ تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ وہ زندہ ہیں بعض حر یہ بات بھی کرتے تھے کہ اگر انگریزوں نے انہیں پھانسی دیکر شہید کردیا ہے تو "اس دنیا سے کالی رات ختم نہیں ہوگی۔ سورج طلوع تو ہوتا ہے لیکن وہ جیسے غمگین ہو۔"

پیر صاحب کو مارچ 1943ء کے آخری دنوں میں پھانسی دیکر شہید کیا گیا تھا لیکن ان کے دو بیٹے جن میں سے ایک کی عمر بارہ اور دوسرے کی دس برس تھی اور اپنی والدہ کے ساتھ کراچی کے ایک بنگلے میں نظر بند تھے۔ اسی زمانے میں فریڈرک ینگ نے میرپور خاص اور پیروٹل کا دورہ کیا تھا اور کئی اثر ورسوخ کے حامل زمینداروں اور ہاریوں اور سرکاری اہلکاروں سے بات چیت کی تھی اسے معلوم ہوا تھا کہ ان میں سے کئی ایک کا پیر صاحب کو پھانسی دیکر شہید کرنے والی بات پر اعتبار نہ تھا کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ پیر صاحب کو پھانسی نہیں دی گئی ہے بلکہ ان کی روح جنت کی طرف روانہ ہوگئی ہے لوگوں کے شکوک و شبہات کو ختم کرنے کے خیال سے پیر صاحب کی وفات سے متعلقہ تصاویر کو سانگھڑ، نجھورو، کھپرو، خیرپور ریاست اور سکھر کے عام مقامات پر لگائی گئی تھیں۔ جن میں سندھی زبان میں یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی تھی کہ پیر صاحب اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔

سکھر سی آئی ڈی کے صوبیدار نے 8 اپریل 1943ء کو ایک رپورٹ بھیجی تھی کہ یہاں کے زمیندار اور ہاری اس بات پر یقین کا اظہار کرچکے ہیں کہ پیر صاحب کو پھانسی دیکر شہید کیا گیا ہے لیکن کئی راسخ العقیدہ مریدوں کا خیال ہے کہ جب پیر صاحب کو پھانسی دی جارہی تھی تو اس وقت فرشتے انہیں آسمان پر لے گئے تھے لیکن انہیں اس بات پر یقین تھا کہ اگر پیر صاحب کو پھانسی پر چڑھایا جاتا تو ان کی میت کو سندھ میں کسی نہ کسی جگہ ضرور دفن کیا جاتا جبکہ سندھ میں ان کی ایسی کوئی قبر موجود ہی نہیں ہے تو پھر انہیں پھانسی دیکر شہید کرنے والی باتیں جھوٹ کا پلندہ ہیں۔

فریڈرک ینگ نے صوبیدار عزیز حسین کی روانہ کردہ رپورٹ کو لمبوک کی طرف بھیج

دیا تھا۔ اس نے مذکورہ رپورٹ پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے تحریر کیا تھا کہ ایسے اقدامات کیئے جائیں جن سے لوگوں کو پیر صاحب کی پھانسی کے متعلق اعتبار آجائے اور ایسا کرنا نہایت ضروری ہے اس کے علاوہ پیر جو گوٹھ میں اس طرح کا اعلان کرانا بھی نہایت ضروری ہے۔ ان اعلانات کے ذریعہ لوگوں کو موجودہ صورتحال سے ناجائز فائدہ حاصل کرنے سے دور رکھا جائے گا۔

نو آبادیاتی نظام کے اعلیٰ اختیارات کے حامل اہلکار پیر صاحب کی اولاد سے سہمے ہوئے تھے جن میں سے ایک ضرور اپنے باپ کی مسند پر بیٹھنے کے بعد پیر پگارا بننے والا تھا۔ لیمبوک نے جولائی 1943ء میں ڈی سی پارٹی کو مشورہ دیا تھا کہ پیر کے دونوں فرزندوں کو انگریز حکومت کے کسی نو آبادیاتی ملک کی طرف روانہ کردیا جائے اور انہیں وہاں کے گورنر کی زیر نگرانی رکھا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ پیر صاحب کے فرزندوں کی سماجی حیثیت کو بحال کیا جائے تاکہ وہ اپنے ملک کے معزز اور محترم شہری بن سکیں۔

تھرپارکر کے کلکٹر برنارڈ نے 12 جولائی 1943ء میں لیمبوک کو لکھا کہ پیر صاحب کے فرزندوں کو ان کے اہل وعیال اور خاندانوں سے الگ رکھا جائے۔ جو ابھی تک ان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ اس خط میں پیر صاحب کے اہل وعیال اور ان کی خادماؤں کی تعداد کی تفصیل وغیر بھی دی گئی تھی۔ دوسرا نقطہ نظر یہ بھی تھا کہ پیر صاحب کی اولاد کو سندھ سے باہر رکھا جائے مسٹر برنارڈ کا خیال تھا کہ ان کو کسی پبلک اسکول میں کم سماجی حیثیت نہ دی جائے لیکن ان کی عزت واحترام وہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء کے مطابق ہوگا۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح کرنے سے یہ نتیجہ نکلے گا کہ جب وہ بڑے ہوجائیں گے تو اپنے صوبے میں آکر حروں کی سابقہ کاروائیوں کا اعادہ نہیں کریں گے۔ بڈ کا خیال دوسرے اہلکاروں کے نقطہ نظر سے مختلف تھا جس کا مشورہ تھا کہ انہیں چیفس کالج لاہور میں تعلیم دی جائے۔ کیونکہ وہاں ان کے لئے بہترین فضا اور ماحول موجود نہ ہوگا۔

سندھ کے گورنر ہیو ڈاؤ نے 10 اگست 1943ء میں وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو کو تحریر کیا کہ پیر صاحب کے دونوں فرزندوں کو ہمیشہ کے لئے ہندوستان سے جلاوطن کردیا جائے۔

مصنوعی ہیں۔

لیمبوک نے اس مسئلے پر کئی ایک پہلوؤں سے سوچا تھا اور اس نقطہ پر بحث کی تھی کہ جب تک حروں کو پیر صاحب کے زندہ رہنے کا مکمل یقین ہوگا اس وقت تک وہ پیر صاحب کے فرزند کو سجادہ نشین بنا کر پیر صاحب تسلیم نہیں کریں گے اس طرح نہ ان کو امن وامان قائم کرنے کے لئے قائل کیا جا سکے گا۔ پیر صاحب کے صاحبزادوں میں خاص دلچسپی کا اظہار اس لئے نہیں کیا جائے گا کیونکہ ان کو یہ خوف دامن گیر ہوگا کہ اگر انہوں نے اس طرح کیا تو پیر صاحب کے بزرگ فقیر انہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اس سے پہلے لیمبوک سندھ کے گورنر کو مختصراً" سمجھا چکے تھے کہ اگر بالفرض محال سمجھا جائے کہ پیر صاحب زندہ ہیں اور وہ لوٹ کر آئیں گے تو یہ خبر سن کر حر بے چین ہو جائیں گے اور ان میں سے کچھ حر جذباتی ہو کر اپنے آپے سے باہر ہو جائیں گے لیکن اس قسم کا اعتقاد زیادہ عرصے تک قائم نہیں رہ سکتا۔ جنونی قسم کے مرید اس حقیقت پر کبھی یقین نہیں کریں گے۔ لیمبوک اس بات پر بحث کرتا ہے کہ اول تو یہ افواہیں پھیلائی جائیں گی کہ پیر صاحب کو ایک جیل سے دوسری جیل بھیجا گیا ہے یا جاپانی اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس کے بعد پیر صاحب کا کافی عرصے کے لئے مریدوں کی نظروں سے اوجھل رہنا ان میں ایک قسم کی مایوسی پھیلا دے گا۔ جو اپنا اثر ضرور دکھائے گی۔ دوسری بات ایک تصوراتی پیر ایک حقیقی پیر سے زیادہ خوفناک ثابت ہو سکتا ہے۔

آخرکار پیر صاحب کے فرزندوں کو مختصر مدت کے لئے پہلے علی گڑھ بھیجا گیا اور اس کے بعد انگلینڈ۔ پیر صاحب کی املاک کو ایک ٹرسٹ کے حوالے کیا گیا۔ علی گڑھ اور انگلستان میں قیام کے دوران دونوں صاحبزادوں کا خرچ مذکورہ ٹرسٹ برداشت کرتا تھا۔ حروں کو پیر صاحب کو پھانسی دینے کے معاملے کے متعلق اعتماد میں لینا اور اس حقیقت کو تسلیم کرانے کا مقصد اب تک حل نہیں ہوا تھا۔ 10 جنوری 1943ء میں ڈان اخبار کا رپورٹر تحریر کرتا ہے کہ پیر صاحب کو پھانسی کے پھندے پر لٹکائے ہوئے چار سال گزر چکے ہیں لیکن اس کے مرید اب تک اس خیال کے حامی ہیں کہ پیر صاحب زندہ ہیں۔

جامعہ راشدیہ لائبریری پیر جو گوٹھ خیرپور سندھ   بشکریہ ماہنامہ [illegible]

"سورھیہ بادشاہ اور کورٹ مارشل" کے عنوان تحت لکھی گئی کتاب کے مصنف محترم آفتاب نبی ہیں ان کے والد محترم کا اسم گرامی دلشاد نبی ہے ان کی ولادت 1946ء میں ہوئی انہوں نے بنیادی تعلیم سندھ کے عظیم شہر کراچی میں حاصل کی 1967ء میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اقتصادیات) میں کیا۔ اور 1968ء سے سروس کی شروعات کراچی یونیورسٹی میں مقدس پیشے یعنی استاد کی حیثیت سے کی بعد ازاں کمیشن کا امتحان پاس کر کے پولیس ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس (A.S.P) مقرر ہوئے۔ انہوں نے سندھ یونیورسٹی جامشورو سے 1983ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ 1994ء میں نیشنل ڈیفنس کالج اسلام آباد سے "ڈیفنس اینڈ اسٹرائٹیجک اسٹڈیز" میں ایم ایس سی اور 1995ء میں کیمبرج یونیورسٹی سے ایم فل (کرمنالاجی) کی ڈگری حاصل کی۔

آپ 1999ء سے سندھ کے انسپکٹر جنرل پولیس مقرر ہوئے۔ انہوں نے پولیس جیسے سخت اور خشک پیشہ کے لحاظ سے اپنا ادبی اور تحقیقی مشغلہ نہیں چھوڑا ابھی تک اس معاملہ میں ان کو جوانی والا جوش ہے سندھ کی تاریخ اور خاص طور پر "حر تحریک" کے ساتھ ان کی ذاتی دلچسپی ہے جو پولیس افسر ہونے کے ناتے ایک خوش آئند بات ہے۔ انہوں نے انگریز سامراج کے ساتھ ٹکر کھانے والے جنگ آزادی کے ہیرو سورھیہ بادشاہ حضرت پیر صبغت اللہ شاہ راشدیؒ اور حروں پر لکھ کر اپنی دھرتی کا حق ادا کیا ہے اور ابھی بھی اس موضوع پر ان کا قلم رواں دواں ہے۔ انہوں نے وہ دستاویزات جو آج تک ہماری آنکھوں سے اوجھل تھیں، منظر عام پر لا کر ایک بڑا کارنامہ سرانجام دیا ہے۔ ان کی اس سچائی اور کاوشوں کو یہاں کے لوگ کبھی نہیں بھولیں گے جو ان کی روایت رہی ہے۔ میں ان کی صحت، عمر درازی، ترقی کے لئے دعاگو ہوں۔

(مختار وسطرو ویر پبلیکیشن)

ویر پبلیکیشن